فردوسِ گم گشتہ

طاہر

(مجموعۂ خطبات و مقالات)

پرویز

شائع کردہ
طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب ------------ فردوس گم گشتہ

مصنف ------------ پرویز

ناشر ------------ طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

------------ B-25 گلبرگ II لاہور 54660 پاکستان

------------ فون: 5764484-5753666

مطبع ------------ عالمین پریس

تیسرا ایڈیشن ------------ جون 1998ء

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست مضامین

پیش لفظ	۴
دُنیا کی نجات	۸
جنگ	۲۳
فردوسِ گم گشتہ	۳۵
ایمانِ بلاعمل	۴۵
اسلام اور سائنس	۵۴
خدا کی بادشاہت	۷۳
اسلام اور مذہبی رواداری	۹۱
تمسّک بالکتاب	۱۱۰
کیا تمام مذاہب یکساں ہیں	۱۲۷
وراثتِ ارض کا ابدی قانون	۱۶۴
قرآن اور تاریخ	۱۹۲
مسلمان کی زندگی	۲۱۱
یہ زمین کس کی ہے؟	۲۲۹
قرآن کا معاشی نظام	۲۴۶
اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی	۲۶۷
نسخہ اور اس کا استعمال	۲۸۱
خدا اور قیصر	۲۹۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نوعِ انسان کی زندگی میں ایک مدت سے جہنم کی سی کیفیت بپا ہے۔ سائنس کے محیر العقول انکشافات کے باوجود اس کا امن و سکون ہیجان و اضطراب کے لپکتے ہوئے شعلوں کی زد میں ہے۔ حکمائے مغرب کی شبانہ روز کاوشیں اسے اس اضطرابِ مسلسل اور عذابِ الیم سے نجات دلانے میں یکسر خاسر و ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ مفکرینِ عالم کو اپنی شکست کا کھلا اعتراف ہے۔ اور مؤرخ کا قلم علیٰ وجہ البصیرت اس صورتِ حال کا تجزیہ کرنے اور اس کے محرکات کا سراغ لگانے میں اظہارِ عجز پر مجبور ہے۔ کیا کاروانِ انسانیت کو اس جہنم سے نجات دلانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا؟ کیا اس کارگہِ عظیم میں انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ یہی تھا کہ وہ مایوسیوں اور حرماں نصیبیوں کے تپتے ہوئے صحرا میں دم توڑنے کے لئے سرگرداں رہے؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جنہوں نے مفکرینِ عالم کو طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا ہے اور امید کی کوئی ایک آدھ شرمائی ہوئی سی کرن بھی ان کی بے تاب نگاہوں کے سامنے جلوہ بار نہیں ہو رہی۔

چودہ سو سال قبل بھی نوعِ انسان کو اسی قسم کی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اس وقت بھی ظہر الفساد فی البر و البحر کی ایسی ہی کیفیت سے کاروانِ انسانیت دوچار تھا۔ لیکن تاریخ کے اوراق شہادت دے رہے ہیں کہ مایوسی اور بے بسی کی ان اندوہناک تاریکیوں میں ہی وہ صبح بہار نور پاش ہوئی تھی جس کی روشنی میں کاروانِ حیات طفولیت کے کٹھن مرحلوں سے گزر کر عالمِ شباب میں داخل ہوا۔ یہی سعادت آفریں دور تھا جس کا آغاز حضور رسالتمآبؐ کی اس دعوتِ انقلاب سے ہوا جو قرآن کی صورت میں قیامت تک کے لئے زندگی کی نئی منزلوں کا سراغ دے گئی اور اپنی عطا فرمودہ ابدی اور مستقل اقدارِ حیات سے ایک ایسا عالم آرا نظام متشکل کر گئی جس میں ہر نوعِ غلامی کے بندھن ٹوٹ گئے اور یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور

سے جگمگا اٹھی۔

انسانی تاریخ کا یہ حادثۂ عظیم تھا کہ انسانیت کو قرآن کی اس حیات آفریں روشنی سے زیادہ دیر تک کسبِ ضیا نصیب نہ ہوا۔ اور ابھی نصف صدی بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ سازشِ عجم کی روباہ بازیاں اور دسیسہ کاریاں منظم ہو کر منظرِ عام پر آ گئیں۔ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ اپنی مفاد پرستیوں کی بے تابیوں میں اس سازشِ عجم کا امین و سرپرست بن گیا اور اس ملی بھگت سے عجمی اسلام کا وہ تانا بانا تیار ہوا جس کے دبیز و دل فریب پردوں میں قرآن کی روشنی گم ہو کر رہ گئی اور پھر اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اس روشنی کو ازسرِ نو اُبھرنا نصیب نہ ہوا۔ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کے اقانیم ثلاثہ نے اپنے مقاصدِ مشئومہ کو وہ تقدیس عطا کی کہ غلامی کی جن زنجیروں کو قرآن نے توڑ کر رکھ دیا تھا وہ پھر سے نوعِ انسانی کے زیبِ گلو بنا دی گئیں اور انہیں جزوِ دین بننے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

قرآن کے خلاف یہ سازش درحقیقت نوعِ انسان کے بہترین مفادات اور اس کی حقیقی آزادی کے خلاف سازش تھی۔ اور اس کا نقصان کسی خاص قوم یا مخصوص خطۂ زمین کو ہی نہیں پہنچا بلکہ اس نے پورے کاروانِ انسانیت کو ان پُر پیچ راہوں کی طرف موڑ دیا جن پر چلتے ہوئے وہ صدیوں تک کے لئے ان برکتوں اور سعادتوں سے محروم ہو گیا جو قرآن اُسے عطا کرنے آیا تھا۔ ہر نوعِ غلامی سے نجات اور عالمگیر انسانیت کا قیام قرآن کی دعوتِ انقلاب کا نقطۂ ماسکہ تھا اور جب سازشِ عجم کی کرشمہ سازیوں نے اسے نگاہوں سے اوجھل کر دیا تو کاروانِ انسانیت ہر اس متاع سے بے نصیب ہو گیا جو قرآن کی عالمگیر اور عالم آرا دعوت کا شیریں ثمر قرار پاتی ہے۔ نوعِ انسان کی ساری حرماں نصیبیوں کا مرکز و محور آج یہی حادثۂ عظیم ہے جو قرآن کے خلاف اس سازشِ عجم نے بپا کیا اور جب تک انسان کو اس کی گم گشتہ منزل سے متعارف نہیں کرایا جاتا اسے اس جہنم سے نجات نہیں مل سکتی۔

اسے انسانی سعادت کا حرفِ آغاز کہیئے کہ اسی بیسویں صدی عیسوی میں بعض سعید روحیں اس مقصدِ عزیز کو لے کر اُٹھیں کہ دبیز پردوں کو اُلٹ کر قرآن کی روشنی کے ایک بار پھر فردوسِ نگاہ بننے کا سامان پیدا کیا جائے۔ اور فریب خوردہ کاروانِ انسانیت کو پھر اس منزل کا ذوقِ سفر عطا کیا جائے جس کی راہ نمائی قرآنی تصورات کا منشاء و مقصود ہے۔ ان قابلِ قدر شخصیتوں میں علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) اور علامہ اقبالؒ کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ علامہ جیراجپوری نے قدامت پرست مذہبی طبقہ کو بالخصوص مخاطب کیا اور

اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ وہ کیوں قرآن کی بارگاہ سے دُور ہٹتے چلے گئے۔ علامہ اقبالؒ کی دقتِ نگاہ نے نئی نسل کے رجحانات و میلانات کا جائزہ لیا اور حسن بیان کی مخصوص دل کشی سے انہیں شمع قرآنی کے قریب لانے کی سعی فرمائی۔ شعر و ادب کے انوکھے اور دلآویز پیرائے میں انہوں نے اس حسن و خوبی سے قرآنی تصوّرات کو نشر کیا جس کی مثال صدیوں سے ہماری تاریخ میں موجود نہیں تھی۔ اسلام کے ان مفکرین عظام کی یہ گراں قدر فکری کاوشیں ہماری تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اور آیندہ نسلیں انہیں ہمیشہ قدر و احترام اور فخر سے یاد کریں گی۔

ان بلند مرتبت حضرات کے بعد مفکرِ قرآن جناب پرویز مدظلہٗ کی جلیل القدر شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن کے اس شہرۂ آفاق طالب علم نے سالہا سال تک ہر دو متذکرۃ الصدر زعماء کی بصیرتِ قرآنی سے کسبِ ضیا کا شرف حاصل کیا۔ ان کی عقابی نگاہ نے قدیم و جدید ہر دو مکاتبِ فکر کے لٹریچر کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ حق و باطل کے امتیاز میں خدا کی آخری کتاب (قرآن کریم) ہمیشہ ان کے نزدیک معیار قرار پائی۔ اسی میزان پر انہوں نے عہدِ رفتہ کے علمی سرمائے کا وزن کیا جو اس معیار پر پورا اُترا اُسے دین کے مطابق قرار دیا اور جسے اس آسمانی معیار نے غلط قرار دے دیا اُسے مسترد کر دیا۔ مذہبی اجارہ داری کے پیشوا اور قدامت پرستی کے دیوتا غیظ و غضب کے جوش میں آگ بگولہ ہوئے لیکن علم و بصیرت اور دلائل و براہین کے چیلنج کو قبول کرنے کی کبھی جرأت نہ کی۔

محترم پرویز صاحب آج دعوتِ قرآنی کے عظیم و جلیل نقیب ہیں۔ ان کی یہ دعوتِ انقلاب، مسلکِ تقلید کی قدامت پرستی اور بے لگام تجدد پسندی دونوں کے خلاف کھلا چیلنج ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک توازن بدوش نشان راہ بھی۔ قدیم و جدید کی معرکہ آرائی کے بین بین مستقل اقدارِ حیات کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے سنگِ میل اس دعوتِ قرآنی کے وہ حسین و جمیل شاہکار ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف فکر و بصیرت کی بارگاہوں میں لگایا جاسکتا ہے۔ مذہبی جذباتیت کی تندی ان شہ پاروں کی نُدرت کو کیونکر جانچ سکتی ہے! اس مختصر سے افتتاحیہ میں ان شہ پاروں کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں۔ اجمالاً یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک جو کچھ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اشاعت پذیر ہوا ہے اس میں سلسلہ معارف القرآن کی مختلف جلدیں — جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، ابلیس و آدم اور من و یزداں — سرفہرست ہیں۔ "انسان نے کیا سوچا؟" اسی سلسلہ کی ایک دوسری کڑی ہے اور علمی حلقوں میں خصوصی امتیاز کی حامل

اسی کا دوسرا حصہ "خدا نے کیا کہا؟" ("اب "اسلام کیا ہے؟") کے نئے نام سے عنقریب شائع ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔
"سلیم کے نام خطوط" (تین جلدیں) اور "طاہرہ کے نام خطوط"۔۔۔۔۔۔ اسی سلسلۂ اشاعت کے وہ دلآویز شاہکار ہیں جن میں اچھوتے حسنِ انداز سے ہماری نئی نسل کو قرآن کا پیغام دیا گیا ہے۔ "نظامِ ربوبیت" اس قرآنی نظام کا عکسِ جمیل پیش کرتی ہے جو انسانی زندگی میں جنتِ ارضی کی بساط بچھا دیتا ہے۔

گزشتہ چار برس سے "لغات القرآن" اور "مفہوم القرآن" کے نام سے پرویز صاحب کی سالہا سال کی جان توڑ کاوشوں اور عرق ریزیوں کا ایک نیا سلسلہ منظرِ اشاعت پر آ رہا ہے اور قرآنی تعلیمات و تصوّرات کے اس عظیم الشان انسائیکلوپیڈیا کی بدولت علمی مجالس ایک نئی پیش کش کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ پرویز صاحب کے بصیرت افروز اور گراں بہا مقالات طلوعِ اسلام کے صفحات پر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان گہرہائے آبدار کو ایک سلک تنظیم میں لا کر یکجا طور پر شائع کر دیا جائے تاکہ قرآنی حقائق کے یہ گلہائے رنگارنگ گلدستوں کی صورت میں جنت نگاہ بن سکیں۔ ۱۹۵۴ء میں اسی بنا پر "فردوسِ گم گشتہ" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں ۱۹۳۸ء سے سن مذکور تک کے مضامین اور وہ نشری تقاریر شامل تھیں جو پرویز صاحب نے وقتاً فوقتاً ریڈیو سے نشر کیں۔ یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اس کے بعد کئی سالوں سے اسکی مانگ برابر جاری رہی۔

"فردوسِ گم گشتہ" کے اسی نام سے یہ جدید ایڈیشن اب قارئین کے سامنے آ رہا ہے۔ اس ایڈیشن میں طبعِ اوّل کے چند مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ باقی مضامین اور نشری تقاریر ایک دوسرے مجموعہ میں شامل ہوں گے جو اسکے بعد شائع ہوگا۔ یہ نئی ترتیب پرویز صاحب کی نظرِ ثانی سے تکمیل پا رہی ہے اور نفسِ مضامین کے لحاظ سے اس میں ایسے مقالات کو بھی شامل کیا گیا ہے جو طلوعِ اسلام کی ۱۹۵۴ء کے بعد کی اشاعتوں میں طبع ہوئے ہیں۔ مضامین کی اس نئی ترتیب میں نفسِ موضوع کی مناسبت کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح یہ سلسلۂ ترتیب قارئین کے لئے حسبِ ضرورت موضوع تلاش کرنے میں پوری سہولت مہیا کرے گا۔

صفدر سلیمی

اپریل ۱۹۶۳ء

دُنیا کی نجات

(جنوری ۱۹۴۲ء)

جاڑے کی کپکپاتی رات ہے۔ کرزن روڈ (نئی دہلی) پر، وسیع پائیں باغ کے اندر، ایک مرمریں قصرِ مزیّن کے بند روشندان کے شیشے سے بجلی کے لیمپ کی شعاعیں حسنِ بے پروا کی بیتابیٔ نمائش کی غمازی کر رہی ہیں۔ کمرہ ایرانی قالینوں، افرنجی صوفوں اور حریر و اطلس کے زرنگار پردوں سے، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی، اور مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے۔ بلوری ساغروں کی کھنک اور آتشِ سیّال کی دمک، یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے۔ آتش دانوں میں کوئلہ دہک رہا ہے، جس کے شعلے اُبھر اُبھر کر اس جہانِ رنگ و تعطر کو جھانکتے ہیں، لیکن سُرخیٔ غازہ اور ارغوانیتِ صہبا کے سامنے ماند پڑ کر آتشِ حسد سے جل بجھتے ہیں۔ کیف و سرور کی اس دنیا میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب "انسان" ہیں۔ انہیں اس پر اختیار ہے کہ جب جی چاہے فطرت کے عطیۂ عظمیٰ، امتیازِ انسانیت، یعنی عقل و ہوش کو کھو دیں۔ لیکن جماد و نباتات کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ پتھر کا کوئلہ اپنے فریضۂ منصبی کی سرانجام دہی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرمِ عمل ہے۔ وہ اس فضا کی ہوش رُبا رنگینیوں سے متاثر نہیں۔ وہ اپنی گیس کو برابر فضا میں پھیلائے جا رہا ہے۔ دروازے، کھڑکیاں، روشندان، سب بند ہیں۔ کمرے کی ہوا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر مسموم ہوتی جا رہی ہے۔ حتّٰی کہ دم گھٹنے کی نوبت آپہنچی۔ ان میں سے جو مدہوش و خود فراموش ہیں، انھیں تو فطرت کی یہ تنذیر بھی نہیں چونکا سکی۔ لیکن جن میں ابھی کچھ ہوش باقی ہے، انھیں فضا کی سمیت کا احساس ہوا۔ کوئی بیتابانہ دروازے کی طرف لپکا، کوئی کھڑکی کی جانب بھاگا۔ اس وقت نہ ساقی کا خرامِ ناز اُن کی راہ میں حائل ہوا، نہ نغمۂ مطرب کی دلکشی دامن گیر۔ نہ کسی کو صراحی کے ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے، نہ پیمانہ کے لُڑھکنے کا احساس۔ اس وقت تمام تر توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کس قدر سردی ہے، اس کا بھی کسی کو خیال

نہیں. ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے. اس افراتفری میں چیخنیاں بھی نہیں کھلتیں. اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کو روندنے اور مسلنے تک سے بھی گریز نہیں. یہ کیا ہوا؟ وہ محفل جو ابھی ایک ثانیہ پہلے، عیش وطرب کی جنت دکھائی دے رہی تھی، کرب والم کا جہنم کیوں بن گئی؟ کیف و سرور کے وہ جاں نواز نظارے جن کے متعلق جی چاہتا تھا کہ کسی ساحر کے ہاتھ کی ایک طلسمی جنبش سے ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے مقام پر منجمد ہو کر رہ جائیں "تاکہ زمان و مکان کے حوادث ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ پیدا کر سکیں، انھیں خود اپنے ہاتھوں سے یوں پریشان کیوں کر دیا؟ اس لئے کہ خلافِ فطرت فضا کی کثیف ہوا میں سانس لینے سے جان پر بن گئی، اور جان بچانے کے لئے پھر فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی. اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں کو سر مار مار کر توڑنا پڑا. آئینِ فطرت کی خلاف ورزی کب تک کی جا سکتی تھی. بند کمرے میں کوئلہ سلگانے کا فطری نتیجہ تھا کہ دم گھٹنے لگ جائے.

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لیکن سانس کا مسئلہ تو انسان کی طبعی زندگی (PHISICAL LIFE) سے متعلق ہے. اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں. جس کمرہ میں ان تمام انسانوں نے اس طرح بھاگڑ مچائی وہاں ان کے ساتھ دو تین کتے

انسان اور حیوان کی زندگی کا فرق

بھی تھے انھوں نے بھی ان ہی کی طرح دروازوں سے ٹکریں ماریں. وہ بھی باہر نکلنے کے لئے ان ہی کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ، بے قرار و بیتاب تھے. لیکن کیا انسان اور کتے میں کوئی فرق نہیں؟ کیا دونوں کی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے؟ یہ تو غلط ہے. ابھی دم گھٹنے سے پہلے اس کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی کیف و مستی میں کتے کا کوئی حصہ نہ تھا، حالانکہ وہ بھی برابر کا شریکِ بزم تھا. سو ظاہر ہے کہ اس حصے کا تعلق زندگی کے کسی ایسے "شعبے" سے ہے جو حیوان اور انسان میں مشترک نہیں، بلکہ انسان کے لئے مختص ہے. اور اگر یہ انسان کے لئے مختص ہے تو لامحالہ اس کا اثر بھی (اچھا ہو یا بُرا) "حیوانی زندگی" سے ماوراء ہے. اور جب یہ کیفیت دنیائے لذّت وطرب میں ہے تو ذمہ داریوں کی دنیا میں یہ اختصاص اور بھی بڑھ جاتا ہے. یہ وہ اختصاص ہے جس کا تعلق "انسانیت" سے ہے. جس طرح طبیعی زندگی کے لئے آئین و ضوابط متعین ہیں اُسی طرح دنیائے انسانیت کے لئے بھی دساتیر و قوانین مقرر ہیں. پھر جس طرح طبیعی زندگی سے متعلق آئین و ضوابط کی خلاف ورزی سے مُضر اثرات کا نمودار ہونا لازمی ہے، اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قوانین سے سرکشی برتنے سے ضرر رساں

نتائج کا مترتب ہونا تقاضائے فطرت ہے. فرق صرف اتنا ہے کہ طبیعی زندگی سے متعلق اثرات کا احساس جلد اور بدیہی طور پر ہو جاتا ہے' اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج و عواقب کے لئے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور دیدہ وری بھی. یہ اثرات سر کی آنکھوں کے بجائے دل کی آنکھوں سے جلدی اور متعین طور پر دیکھے جا سکتے ہیں.

اب ذرا کرزن روڈ کے متذکرہ صدر کمرے کی دیواروں کو پھیلانا شروع کیجیے. حتیٰ کہ یہ پھیلتے پھیلتے یورپ کے چاروں گوشے بن جائیں. جو کچھ اس کمرے کے اندر ہو رہا تھا اس کا مجموعی نام تہذیبِ مغرب رکھ لیجیے. رنگ و

تہذیبِ مغرب

چنگ کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے مغرب کی نگاہیں' حیوانی زندگی کے مقتضیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھیں. انھوں نے اشیائے فطرت کو مسخر کیا' لیکن کس لئے؟ صرف اس لئے کہ وہ ان کی حیوانی خواہشات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بن سکیں. وہ ساقی اور مطرب کی جلوہ ریزیوں اور عشوہ طرازیوں میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ انسانیت کے تقاضوں کی یاد ہی باقی نہ رہی. وہ اس طوفانِ کیف و مستی میں غرق تھے اور اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ گرد و پیش کی فضا میں کیا ہو رہا ہے.

لیکن جنھیں اللہ نے دیدۂ بینا عطا فرمایا تھا' ان کی نگاہیں کوئلے کے اس مسموم گیس پر تھیں جو ہوا میں اس قدر کثافت پیدا کئے جا رہی تھی. جس طرح ایک طبیبِ حاذق' سنکھیا کھانے والے کے انجام کے متعلق بہت پہلے آگاہ کر سکتا ہے' اسی طرح ایک مردِ مومن' جسے اللہ تعالیٰ قرآنی بصیرت عطا فرمائے' قوموں کی روشِ زندگی سے ان کے مآل کے متعلق اندازہ لگا لیتا ہے اور اُس کے آئینۂ ادراک میں وہ حوادث اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں جو ابھی ضمیرِ فلک میں پہلو بدل رہے ہوں. اس لئے کہ جس طرح حیوانی زندگی سے متعلق فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں' اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق بھی اس کے دساتیر و ضوابط ناقابلِ تغیر ہیں. ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا. لہٰذا جس طرح ایک طبیبِ حاذق خواص الاشیاء کے علم کی بناء پر اس کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں چیز کا طبعی نتیجہ کیا ہونا چاہیئے' اسی طرح ایک قرآنی مفکر اقوام و ملل کے امیال و عواطف کو قرآنی میزان میں رکھ کر پہچان لیتا ہے کہ ان کی فلاں روش انھیں کس منزل کی طرف لئے جا رہی ہے. ایک ایسا ہی مردِ مومن تھا جس نے اپنی فراستِ[1] ایمانی سے آج سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے." اللہ کا نور اس کی کتاب ہے.

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اسکا آشیانہ (اقبالؒ)

لیکن مادہ پرستی کے نشہ میں سرشار مغرب کو ہوش کہاں تھا کہ وہ ان تنبیہات پر کان دھرتا. وہ اپنی روش میں مست رہا اور فضا کثیف سے کثیف تر ہوتی چلی گئی. تاآنکہ اس کی سمیت اس حد تک بڑھ گئی کہ اس میں دم گھٹنے لگا. اور آج حالت یہ ہے کہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسان اطمینان کا سانس لے سکے.

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٨/٢٥﴾

عذابِ خداوندی

اور اس فتنہ سے بچتے رہو جو اگر اُٹھا تو اس کی زد صرف اُن ہی پر نہیں پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں (بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے) اور جان لو کہ اللہ کا قانون نتائج پیدا کرنے میں بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے.

ان کے ساتھ دوسرے لوگ اس لیے زد میں آجاتے ہیں کہ ع

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اس زہر آلود تمدن کا سرچشمہ اگر یورپ تھا تو باقی دنیا بھی اس کی پرورش میں برابر کی ممد و معاون تھی. اس لئے یورپ کی بھٹیوں سے اُبھرنے والی آگ کے شعلوں کی لپیٹ سے باقی دنیا کیسے محفوظ رہ سکتی؟ عذاب آیا اور اس انداز سے کہ جو جو شکلیں ذہنِ انسانی میں متصور ہو سکتی تھیں سب آنکھوں کے سامنے آگئیں.

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ ﴿٦/٦٥﴾

کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پیروں تلے (نیچے سے) کوئی عذاب پیدا کر دے. یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو. اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت (قوت) کا مزہ چکھے.

غور فرمائیے! ان میں سے کونسی شکل ہے جو باقی رہ گئی ہے. آسمان سے عذاب، زمین سے عذاب، پانی میں عذاب. ایک قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار. ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا. اور ایک دوسرے کی

شدتِ قوت کا شکار. اور پھر ایسے ایسے مقامات سے عذاب جو اس سے پیشتر وہم دگمان میں بھی نہ تھے. ابھی کل تک آسٹریلیا اور بحر الکاہل کے دیگر جزائر محفوظ ترین مقامات خیال کئے جاتے تھے، لیکن آج یہ جگہیں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں.

فَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۳۹/۲۵)

اُن پر ایسے ایسے مقامات سے عذاب آیا جو اُن کی عقل و شعور (اور وہم وگمان میں بھی) نہ تھا.

اس دَم گھٹنے والی فضا میں جن اربابِ فکر کو کچھ ہوش باقی ہے، اُن کے دل میں فطرت کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی ہے. وہ اِدھر اُدھر دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں بیتابانہ دوڑ رہے ہیں. ان ہی میں جریدۂ اسٹیٹسمین کے مدیر آرتھر مور بھی ہیں. یہ صاحبِ قلم میدانِ صحافت وسیاست کے بالغ نظر شہسوار سمجھے جاتے ہیں. انھوں نے سالِ گزشتہ متحارب ممالک[1] کا دورہ کیا اور ان اسباب وعلل کی تلاش میں سرگرداں رہے جو موجودہ خلفشار کا موجب ہیں. انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے اخبار میں "ہماری موجودہ جنگ" کے عنوان سے ایک مسلسل مقالہ لکھنا شروع کیا، جو گذشتہ ماہ سے التزاماً شائع ہو رہا ہے. انھوں نے اس مقالہ میں زندگی کے موجودہ مسائل کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کی ہے. ہر چند یہ کوشش ایسی کامیاب نہیں، جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی (اس لئے کہ وہ حقائق کا مطالعہ تنہا عقل کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں. علمِ خداوندی کی روشنی ان کے پاس نہیں. اور جب انسان کے پاس علمِ خداوندی کی روشنی نہ ہو تو اس کی حالت آسمان میں چمکنے والی بجلی کی روشنی میں چلنے والے کی سی ہوتی ہے کہ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ (۲/۲۰) "جب فضا اس کی چمک سے روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رُک جاتے ہیں" باایں ہمہ مسٹر مور کی طلب وجستجو اور تپش وخلش سے اتنا ضرور مترشح ہو رہا ہے کہ مغرب اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کے ہاتھوں کس درجہ تنگ آچکا ہے اور نظامِ حیات کو آئینِ فطرت کے مطابق متشکل کرنے کے لئے کس درجہ بیتاب ہے. مسٹر مور

آرتھر مور کا تبصرہ

---

[1] وہ ممالک جو دوسری جنگِ عظیم میں اُلجھے ہوئے تھے.

مختلف سیاسی نظریات و رجحانات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک عالمگیر جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہیں؛ اور یہ وہ چاکِ داماں ہے جس کی تدبیر رفو سے نہیں ہو سکتی۔ یہ آگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل کر رہے گی۔ اور جب ہٹلر اور مسولینی ختم ہو جائیں گے تو اُن کے بعد بھی صفحۂ ارض کے ایک بڑے حصے پر اس آگ کا سلسلہ جاری رہے گا ـــــ باہم خانہ جنگی یا مختلف طبقات کی لڑائی کی شکل میں ـــــ اس مصیبت کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ آج ہٹلر کے انفرادی مقصد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، اُن میں خود ایک مشترکہ اجتماعی مقصد اور عقیدہ پیدا ہو جائے"۔ (اسٹیٹسمین ۱م ۲۶/۱۲)

اس اجتماعی عقیدہ یا مقصد کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

"ساکنانِ ارض کو ہم اندازاً دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں، اور دوسرے وہ جن کا کوئی عقیدہ نہیں۔ وہ نظامِ جدید جسے ایک طرف ہٹلر اور دوسری طرف اشتراکیین پیش کر رہے ہیں مستقبل کے متعلق ایک عقیدہ کی شکل لئے ہوئے ہے۔ ان کے نظامِ جدید یا عقیدہ میں ارتقاء کا تصور ناگزیر ہے۔ لیکن کس قسم کا ارتقاء؟ ایک اندھی قوت کا ارتقاء ان کے ہاں عقل کو بڑا بلند درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن عقل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مادی تغلّب اور اس کے لئے اجتماعی نظم و نسق پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تو اُن کی کیفیت ہے جن کے ہاں مقصدِ زندگی ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے برعکس دوسرے ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ ارتقاء کا۔ وطن پرستی، فرضِ منصبی کا احساس، غصہ، نفرت یا محض مجبوری۔ ان کی قوتِ عمل کے محرّکات ہیں۔۔۔۔۔۔ ارتقاء کی جدوجہد میں ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بندر سے انسان تک کی ارتقاء کی کڑیاں تو تسلیم کر لیں گے لیکن یہ چیز ان کے تصور میں نہ آسکے گی کہ ارتقاء کا سلسلہ لامتناہی ہے اور اسے انسان سے آگے بھی بڑھنا ہے"۔ (اسٹیٹسمین ۲۵، نومبر ۱۹۴۱ء)

یہ ہے مسٹر مور کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ حالت۔ اب دیکھئے کہ وہ اس مصیبت کا حل کیا تجویز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

مصیبت کا حل

"اس عالمگیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور ایک نظامِ جدید کو متمکن کرنے کے لئے مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج سے ایک

جدید مذہب کی تشکیل ایسی ہی ضروری ہے جیسی آلات و سامانِ حرب کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی۔"
(ایضاً)

مذاہب کے امتزاج سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی صداقتوں کو حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک ایسے مذہب کی تشکیل کی جائے جو حیوانی ارتقاء کی بجائے لاہوتی ارتقاء (DIVINE EVOLUTION) کا موئید ہو۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہم مذہبی ارتقاء کے عقیدہ کا جواب لاہوتی عقیدہ سے دیں گے۔ بشرطیکہ یہ عقیدہ انسانیت کے مذہب کی حیثیت اختیار کرلے۔ ظاہر ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ یعنی ان مختلف مذاہب، مثلاً عیسائیت، اسلام، ہندومت، بُدھ مت، یہودیت وغیرہ میں۔"
(ایضاً)

آپ سرِدست مسٹر جود کی اس پریشانیٔ فکر و نظر کا چنداں خیال نہ کیجئے جو اُن کے تجویز کردہ علاج کے ایک ایک فقرہ سے نمایاں ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ حیوانیت کی زندگی کو منتہائے نگاہ سمجھنے والے خالص دہریت پسند، مذہب گزیدہ، یورپ سے یہ کس قسم کی آواز اُٹھ رہی ہے؟ اس کے بعد مسٹر آرتھر جود لکھتے ہیں:۔

بنیادی مشکل اس مسئلہ کے حل میں یہ ہے کہ کیا انسان ایک مختار بالارادہ ہستی ہے یا مجبورِ محض۔
(ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے:۔

دنیا کو آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس سوال پر ارتقاء کے مسلمہ نظریہ کی روشنی میں از سرِ نو غور کیا جائے۔

یہ غور و فکر کن خطوط پر ہونا چاہیئے۔ وہ اس کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

اس وقت جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اغلباً ہر ایک اس صداقت کو تبرکاً بطور یادگار محفوظ رکھے ہوئے ہے جسے اس کے بانی نے سمجھا۔ لیکن یہ صداقتیں زمانۂ قدیم کے مذہبی معتقدات اور فروعات میں کچھ اس طرح گھر چکی ہیں کہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور وہ دورِ حاضرہ کے انسان کے لئے ناقابلِ اطمینان صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ہر ایک ملک میں روشن خیال طبقہ مذہب کو چیلنج دے رہا ہے۔ اور اس طرح مذہب

کی گرفت ہر جگہ ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نفسِ مذہب کو (نہ کہ اس مذہب اور اُس مذہب کو) اس انداز میں پیش کیا جائے کہ انسان کی بصیرت اُسے تسلیم کر لے۔ مذہب پر ارتقاء کے مسلّمہ نظریہ کی روشنی میں از سرِ نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔

(ایضاً ۴۱/۱۱/۲۶)

اس کے بعد مسٹر مور لکھتے ہیں کہ جامد مذہب نے (یعنی ایسے مذہب نے جو انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے) لوگوں میں بے حسی اور تعطّل پیدا کر رکھا ہے۔ اس لئے اگر مذہب کو ارتقائی نظریہ کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اس صورت میں۔

نسلِ انسانی کی تدریجی تکمیل اور زمین پر خدائی بادشاہت کا تصوّر ایک جوش انگیز امکانی شکل اختیار کر لے گا۔ (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے:۔

عروج و ارتقاء (EVOLUTION) میں خدا کا تصوّر جامد نظریۂ تقدیر اور ہر قسم کے تعطّل اور بے حسی کا نقیض ہوگا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اگر کسی طرح یہ معلوم کر سکیں کہ "**خدا کی مرضی**" کیا ہے تو اس کا علم ہمارے اندر سحر پھونک دے گا اور اس طرح ہماری مرضی خدا کی مرضی کا گویا عکس بن جائے گی اور ہم ایک جدید مفہوم میں ارتقاء کے اس لاانتہا ہی ملکوتی ڈرامہ میں ایک با اختیار فعال ایکٹر کی حیثیت سے حصّہ لے سکیں گے۔ (اسٹیٹسمین۔ ۲۶۔ نومبر ۱۹۴۱ء)

آج دنیا جس عدم اطمینان و فقدانِ سکون کے جہنّم سے گزر رہی ہے، اس کی علت بیان کرتے ہوئے مسٹر مور لکھتے ہیں:۔

ایک ایسی دنیا جہاں مصنوعات نوعِ انسانی کی خدمت کی غرض سے نہیں بلکہ اس مقصد سے تیار کی جائیں کہ ان کی فروخت سے دوسروں کا روپیہ بٹورا جائے۔ دولت سب سے اہم مسئلہ بن جاتی ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ جمع کیا جائے۔ قوت اور حفاظت روپیہ کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ دولت کی ملکیت کامیابی کا نشان اور فخر و عزت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ آج کوئی پند و نصیحت اس جذبہ کو بدل نہیں سکتی...... اس کے لئے جونہی ہمیں اس امر کا یقین ہو جائے کہ ہمارا موجودہ نظامِ معیشت ٹوٹ چکا ہے اور دوسرا

کوئی ایسا نظام موجود ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے، تو ہمیں اپنا موجودہ نظام بدلنا پڑے گا.

(اسٹیٹسمین ۴۰/۱۱/۲۸)

ان اقتباسات میں جہاں ایک طرف صاحبِ مضمون کی پریشانیٔ فکر ونظر، ان کی بیتابیٔ قلب کی غماز بن رہی ہے، دوسری طرف طلب و جستجو کی تڑپ بھی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے. صاف نظر آرہا ہے کہ مسموم فضا کی کثیف ہوا سے دَم گھٹ رہا ہے اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں دیوانہ وار جدّوجہد ہو رہی ہے. مسٹر مور نے جو کچھ اپنے مقالہ کی ان تین چار اقساط میں لکھا ہے (جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں) اس کا ماحصل چند الفاظ میں یہ ہے کہ

ماحصل

(۱) دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب مغربی نظامِ تمدّن کے ثمرات ہیں.

(۲) وہ نظامِ تمدّن جس میں منتہائے نگاہ حیوانی مقتضیات زندگی سے آگے نہیں بڑھتا جہاں انسان کو سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی سمجھ کر مستقبل کی ذمّہ داریوں سے آزاد کر دیا جاتا ہے. اور جہاں کامیابی، قوّت اور عزّت کا معیار، دولت کا حصول واکتناز ہے.

(۳) ہٹلر[1] اور مسولینی[2] فقط اس غیر فطری نظام کے ماہر ہیں. اس لئے اگر انھیں مغلوب بھی کر لیا جائے تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا.

(۴) دنیا میں امن و سکون کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک جدید نظامِ تمدّن و عمرانیت کی بنا ڈالی جائے.

(۵) وہ نظامِ جدید جس میں

(ا) انسان کو سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلہ کو لامتناہی خیال کیا جائے جس میں انسان کو اپنی تکمیل کے لئے عروج اور بلندی کے کئی مراحل طے کرنے ہیں. یعنی ارتقائے انسانی کا نظریہ پیدا کیا جائے. اور

(ب) جس میں کامیابی، قوّت اور عزّت کا معیار، دولت نہ ہو بلکہ جذبۂ خدمت ہو.

(۶) اس نظامِ جدید کو بطور عالمگیر مذہب انسانیت پیش کیا جائے.

---

[1] جرمنی کی تحریک نازی ازم کا ڈکٹیٹر.

[2] اٹلی کی تحریک فاشزم کا ڈکٹیٹر. یہ دونوں، دوسری جنگِ عظیم میں ختم ہو گئے تھے.

(۷) اس مذہب کی تشکیل کے لئے مختلف مذاہب کی صداقتوں کا امتزاج کیا جائے کیونکہ مذہب کے اصلی حقائق ازمنۂ قدیم کی توہم پرستی اور فرعی مسائل میں چھپ چکے ہیں۔

(۸) مذہب کا مقصد جمود و تعطل نہ ہو بلکہ وہ انسان میں قوتِ عمل پیدا کرنے کا ذریعہ ہو، جس سے انسان عروج و ارتقاء کے منازل طے کرسکے۔ نیز وہ بصیرتِ انسانی کو اپیل کرسکے۔

(۹) انسانی جدوجہد کا ماحصل یہ ہو کہ وہ کسی طرح مشیتِ خداوندی (خدا کی مرضی) معلوم کرسکے۔ اور پھر اپنی مرضی کو اس طرح خدا کی مرضی کے تابع کردے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جائے۔

(۱۰) اس طرح اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہوسکتا ہے۔

○

غور فرمائیے! عہدِ حاضر کے نظامِ زندگی کے ستائے ہوئے انسان کو جس چشمۂ سکون وراحت کی تلاش ہے۔ ہرچند وہ اس کا پتہ پریشان الفاظ اور بکھرے ہوئے نشانات سے دے رہا ہے، لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے کہ وہ ٹھیک وہیں پہنچنا چاہتا ہے جہاں انسان کو قرآن پہنچاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی خط وخال ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر غور فرمائیے۔

اسلام کے بنیادی خط وخال

(۱) اسلام میں زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے، جو ایک عبدِ مسلم کے فکر ونظر اور اعمال واحوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یعنی کسی انسان کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری ہیں۔ افراد ہیں۔ انھیں نسلوں یا قوموں میں تقسیم کردینا، وحدتِ انسانیت کی جڑ کاٹ دینا ہے۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہوجاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مارِ پیچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔ آج ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ برسرِ پیکار ہے، ایک ملک دوسرے ملک خلاف فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسانی کو غیر فطری حدود بندیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست وبازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محبوس کرلے۔ اِدھر دل وجگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے،

بلکہ حلق سے نیچے اُترتے ہی جھپٹ لی جائے۔ جس جسم کے نظام میں اس قسم کی نفسانفسی پیدا ہو جائے اس کا انجام معلوم!

(۲) پھر جیسا کہ ارتقاء سے متعلق مضامین میں وضاحت سے بیان کیا جائے گا' اسلام کے نزدیک موجودہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں' بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس سے پہلے صرف حیوانیت کا ارتقاء تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہوگا۔ انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے' جب اس پیکرِ حیوانی میں صفاتِ خداوندی کا کرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ انسان جس قدر ان صفات کو نشوونما دیتا چلا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی جائے گی۔

(۳) اسلام بتاتا ہے کہ انسانیت کا نشوونما ارتقاء زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو خدائے ربّ العالمین کی طرف سے ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ یہی حکومتِ الٰہیہ کا ضابطۂ آئین ہے۔ فطرت کے دیگر قوانین کی طرح اس ضابطہ کے قوانین بھی غیر متبدل اور ناقابلِ ترمیم و تنسیخ ہیں' اور بلالحاظِ زمان و مکاں تمام نوعِ انسانی کے لئے ہیں۔ ان اصولی ضوابط کی روشنی میں ہر زمانے کے اقتضاآت کے مطابق فرعی قوانین مرتب کئے جائیں گے' اور اس طرح یہ نظامِ زندگی' ایک جامد اور ساکن مذہب کے بجائے' انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر راہنمائی کرتا جائے گا۔ قرآن انسانی عقل و بصیرت کو اپیل کرتا ہے' اور اس کے علم و شعور کی پرورش چاہتا ہے۔ اس لئے اس میں توہم پرستی یا اندھی تقلید کو کوئی دخل نہیں۔

(۴) اسلام چند افراد کا نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کا عروج و ارتقاء چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا نظامِ زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کا مرکز خدا کی حاکمیت کا اقرار ہے۔ جس جماعت میں یہ اقرار محسوس طور پر متشکل ہوتا ہے۔ اس کا نام ملّتِ اسلامیہ ہے جس کی شیرازہ بندی ختمِ نبوّت کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ ملّت' ملّتِ واحدہ ہوگی۔ مختلف پارٹیوں میں منقسم نہیں ہوگی۔ ختمِ نبوّت کا عقیدہ انسانی عقل و شعور اور فکر و تدبّر کے نشوونما ارتقاء کا بھی حامل ہے۔ وحی کے ذریعے نظامِ زندگی کے اصول متعین ہوگئے۔ ان اصولوں کے ماتحت جزئیات کی تشکیل انسانی تفقّہ و تدبّر کی رُو سے ہوگی۔

(۵) اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ میں کامیابی' قوّت اور عزّت کا مدار دولت نہیں بلکہ شرفِ انسانیت ہے۔ جس میں یہ شرف (استحکامِ خودی) زیادہ ہوگی' وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔ دولت اور قوّت انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جائے گی' افراد یا کسی خاص گروہ کے استبداد و تغلّب کا ذریعہ نہیں بن جائے گی۔ اس لئے اسلامی نظامِ زندگی میں اکتناز کی بھی اجازت نہیں۔ نہ ہی اس امر کی کہ دولت صرف بالائی طبقہ میں ہی گردش

کرتی رہے، نیچے کے طبقہ میں آئے ہی نہیں۔ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ ان امور پر دلالت کرتی ہیں۔

(۶) یہ ہیئتِ اجتماعیہ جس کی وسعتیں زمان و مکان کی حدود سے محصور نہیں ہوں گی، نظامِ انسانیت کو ضابطۂ خداوندی کے مطابق چلانے کی ذمہ دار ہو گی اور اس طرح خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو جائے گی۔ انسان کو "خدا کی مرضی" اس کے قوانین کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ سو جب انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع لے آئے تو اس کی مرضی عین خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان ایک طرف مختار بالارادہ اور دوسری طرف مجبور ہو گا۔ مجبور اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو ایک آفاقی نظام کے اصولوں کے تابع رکھے گا۔ اور مختار اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو ضابطۂ خداوندی کے تابع اپنے فیصلے سے لائے گا۔ نیز اس لئے کہ اس جبر سے جو اختیار پیدا ہو گا وہ اسے اس قابل بنا دے گا کہ تمام کائنات کو مسخر کر لے۔ استحکامِ خودی اور جوشِ کردار سے یہ اس مقامِ بلند پر پہنچے گا کہ خدا کے سوا کوئی اور قوت اس پر غالب نہ ہو گی۔

(۷) اس ہیئتِ اجتماعیہ میں ہر فرد اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے گا' اس لئے معاملات کی دنیا میں جادۂ عدل و انصاف سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکے گا۔ یہ جوابدہی اس خدا کے سامنے ہو گی جو دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں تک سے واقف ہے۔ اس لئے خدا کے اس بندے کے اعمال و افعال حاضر و غائب یکساں ہوں گے کیونکہ تمام افعال، قانونِ مکافاتِ عمل کے تابع رہیں گے۔ یہی جوابدہی سے مقصود ہے۔ اس نظام میں ہر شخص کو اس کا حق ملتا چلا جائے گا' اور کوئی دوسرے کا محتاج نہیں ہو گا۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس　　(اقبالؒ)

○

یہ ہے مختصراً وہ "مذہب" جس کی آج مسٹر آرتھر مور اور ساری دنیا کو تلاش ہے۔ لیکن مسٹر مور سچا ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس قسم کا مذہب مختلف مذاہب کے امتزاج سے پیدا کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اسے اس قسم کا مذہب کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کہیں گے کہ جب اس قسم کا مذہب (اسلام) موجود ہے تو پھر مسٹر مور کو نظر کیوں نہیں آتا؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اسے اسلام نظر کہاں سے آئے؟ موجودہ مسلمانوں کی زندگی میں تو اسلام نظر نہیں آسکتا۔ باقی رہے اس کے مآخذ، سو وہ اندھی تقلید اور روایات کی چادروں میں اس طرح لپٹے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اب اسلام نام ہے چند رسومات کا' جن سے مدت ہوئی روح نکل چکی ہے۔ یا نام

ہے باہمی سر پھٹوّل کا، جس کا نتیجہ ہماری موجودہ زندگی ہے. جس سے ہم خود نالاں ہیں. کہیئے کہ یہ مذہب تسکین دعروج کے متلاشیوں کے لئے کس طرح جاذبِ نگاہ بن جائے؟ آج اسلام کے لئے دنیا بے قرار ہے، لیکن یا للعجب! کہ تمام عالمِ اسلامی میں خدا کا ایک بندہ ایسا نہیں جو اسلام کو اس کے صحیح خط و خال میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے. مسلمانوں میں جو لوگ مغرب کے کرب والم اور اس کے اسباب وعلل سے واقف ہیں، وہ اسلام سے بیگانہ ہیں. اور جو مذہب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں، ان بیچاروں کو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں. اس لئے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد ہے) اب جویانِ حقیقت تک اسلام کا پیغام کون پہنچائے؟ صدیوں کے بعد مبدأ رفیض کی کرم گستری سے ایک مردِ دانا[1] پیدا ہوا تھا. جو ایمان و حکمت، ذکر و فکر، عشق و عقل، یعنی مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال تھا. لیکن (اسے دنیا کی بدقسمتی کہیئے کہ) وہ ابھی مغرب کو اس کے نظامِ تمدن کے انجام وعواقب سے آگاہ ہی کر رہا تھا کہ وہ دنیا سے چل بسا. اُس وقت چونکہ مغرب کے سامنے اس کے نظام کے اثرات محسوس طور پر بے نقاب نہیں ہوئے تھے، اس لئے اس مردِ دانا کی باتوں کو "پرانے زمانے کے پند و نصائح" سمجھ کر ٹال دیا گیا. آج جب وہ آتش فشاں پہاڑ پھٹا، اور سارا یورپ (بلکہ تمام دنیا) اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے، اگر وہ مفکرِ قرآنی زندہ ہوتا تو وہ اس پوزیشن میں تھا کہ مفکرینِ مغرب کو مخاطب کر کے اسلام کا پیغام دیتا، اور وہ اُس کی سنتے بھی، اور سننے کے بعد اس پر غور بھی کرتے. اُس نے آج سے بہت پہلے یورپ کے نام یہ پیغام بھیجا تھا.

ازمن اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری — عجب ایں است کہ بیمارِ تو بیمار تر است
دانشِ اندوختہ دل زکف انداختہ — آہ ازاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ

○

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

---

[1] حکیم الامت، علامہ اقبالؒ.

دگراست آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک — آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگراست
دگراست آنکہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم — آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگراست
دگراست آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے — ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگراست
اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست — نورِ افرشتہ ز سوزِ دلِ آدم با اوست

اور اس کے بعد کہا ہے

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم (پیغامِ اقبالؒ)

یہی "آئینِ دگر" ہے جسے آج ساری دنیا (NEW ORDER) کے نام سے پکار پکار کر ڈھونڈھ رہی ہے۔ اس "آئینِ دگر" کی وجہِ جواز یہ تھی کہ

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگراست

اُس وقت دنیا کی نگاہیں تہذیبِ نَو کی تابندگی سے خیرہ ہو رہی تھیں، اس لئے وہ "جہانِ دگر" کو کس طرح دیکھ سکتی تھیں؟ یہ "جہانِ نو" اسے نظر آسکتا تھا جس کی آنکھیں قرآنی فراست سے منور تھیں۔ اُس نے اس جہان کو دیکھا اور برملا کہہ دیا کہ

من دریں خاک کہن گوہرِ جاں می بینم — چشمِ ہر ذرّہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز — شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم
کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم — پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک — بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آنکس کہ دریں گرد سوارے بیند — جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند (پیامِ مشرق)

یہ ہے وہ بصیرت و فراست جو قرآنِ کریم عبدِ مسلم کو عطا کرتا ہے۔ کس قدر حسرت انگیز ہے یہ تصور کہ اس مردِ حق شناس کو عمر بھر یہ آرزو رہی کہ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

لیکن آج پورے کا پورا "جنوں کدۂ فرنگ" "مقامِ کبریا" کی تلاش میں ہے لیکن وہ مردِ مؤمن موجود نہیں، جو اسے بتا سکے کہ

مقامِ کبریا کیا ہے؟

بایں ہمہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں. خدائے حیّ وقیّوم کی زندہ و پائندہ کتاب دنیا میں موجود ہے. چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کا نصاب ہے' اس لئے اس نورِ بصیرت کے عام ہونے کی تدبیر ہو کر رہے گی. ہمیں تو صرف اتنا افسوس ہے کہ مسلمانوں کے سامنے سعادت وخوش بختی کا ایسا نادر موقعہ آیا اور یہ اس سے یوں محروم رہ گئے. شاید ان کے جرائم کی پاداش ایسی ہلکی نہیں جو اتنی جلدی ختم ہو جائے.

لیکن ہم لاکھ خطا کار سہی' کیا اس کے سحابِ کرم کی گہرباری سے اتنی بھی امّید نہ رکھیں کہ اس دانہ کو جو ہنوز آغوشِ زمین میں پیوست ہے' اپنی آنکھوں سے "شاخ در شاخ و برومند و جواں" دیکھ لیں. وہ گرد جو آج ساری دنیا کے مطلع کو مکدّر کئے ہوئے ہے چھٹ جائے اور اس کے اندر سے "سوارِ اشہبِ دوراں"[1] جسے دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھیں ترس گئی ہیں' باہمہ جبروت و ملکوت' ہمارے سامنے وجہِ شادابیٔ عالم ہو جائے. اور ایک بار پھر اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ جائے. اے وہ کہ جس کی رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے' کیا تیری درگاہ سے یہ نمناک آنکھیں مایوس لوٹ آئیں گی؟

الٰہی تو تو ربّ العٰلمین[2] ہے!

---

[1] اس سے مراد کوئی "آسمان سے آنے والا" نہیں. اس سے مراد قرآنی نظامِ ملّت اور اس کا مرکز ہے.

[2] پاکستان کا خطۂ زمین (۱۹۴۷ء میں) انہی حسین آرزوؤں کے تصدّق حاصل ہوا تھا.

جنگ؟

(ستمبر ۱۹۵۱ء)

انسان بھی اِک طرفہ تماشا ہے!

اسے عبادت گاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کی شانِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں. اس کی خاک آلود پیشانی پر سطوت و ثروت کے ہزار طرّہ ہائے کہکشاں گیر قربان ہوتے ہیں. اس کے ذوقِ جبیں سائی پر جاہ و جلال کی لاکھوں غلغلہ اندازیاں، اور شوکت و حشمت کی کروڑوں طنطنہ خیزیاں تصدق ہوتی ہیں. اس کی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اس کے قطراتِ انفعال کے مقابل کوثر و تسنیم کی گہرباریاں ناقابلِ التفات ہیں. اس کا ایک ایک سجدہ زمین و آسمان کو وجد میں لاتا ہے، اور اس کے جذبۂ تعبد و تذلل کی شانِ رعنائی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ ؎

ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اور اگر اسے محبت کے حریمِ قدس میں دیکھو تو کسی کی یاد میں ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ ظلمت کدۂ عالم میں شمعِ کافوری کا کام دیں. آفتاب اس کی آتشِ پنہاں سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموّج پیدا کرے. کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تپش و خلش اور سوز و گداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے. اس کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی اس حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ ؎

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں جلوہ بار دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما، زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں

تک کے راز فاش کرتا ہے۔ مہر و مہ و ستارہ، سب اس کی کمندِ تخیّل کے اسیر ہوتے ہیں۔ یہ زہر سے تریاق بناتا ہے۔ جو نوعِ انسانی کے ہلاکت انگیز ناسور کے لئے مرہم جاں بخش کا کام دیتا ہے۔ اس کے فنونِ لطیفہ کی اختراعاتِ جمیلہ اس عارو یابس مجلسِ آب و گل کو جذبات و احساسات کی حسین جنت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس کی صنعتی گلکاریاں، تہذیب و تمدن کے قصرِ بلند میں نور و نکہت کے سامان ارزاں کرتی ہیں۔ یہ ان نوادرات کی متاعِ گراں بہا کے پیشِ نظر خالقِ کائنات کے سامنے بجا طور پر فخر کرتا ہے کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

لیکن

یہی انسان جب جذبۂ انتقام و ہوسِ خون آشامی سے مغلوب ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف غم و غصہ میں بھرا ہوا اُٹھتا ہے، تو عبودیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا نورِ بصیرت، سب ایک ایک کر کے الگ ہو جاتے ہیں اور اسکی خوفناک سبعیت و بربریت، وحشی درندوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک آتش بار اژدھے کی طرح پھنکارتا اور ایک ہیبت ناک شیر کی طرح گرجتا اُٹھتا ہے۔ اور تہذیب و تمدن، عقل و ہوش، علم و بصیرت، عدل و انصاف، رحم و کرم، غرضیکہ جوہرِ انسانیت کی ایک ایک خصوصیت کو کچلتا، روندتا، طوفانِ بلا کی طرح آگے بڑھتا اور ایک بھیانک عفریت کی طرح اپنا آہنی پنجۂ استبداد فریقِ مقابل کے سینے میں گاڑ دیتا ہے اور اپنے دندانِ حرص و آز اس کی رگِ جاں میں پیوست کر کے اس کے چشمۂ حیات سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی قوت کے نشہ میں اس قدر بدمست ہو جاتا ہے کہ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دلیل و برہان کا جواب تیغ و سنان سے دینا چاہتا ہے۔ وہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملات سلجھانے کی بجائے فریقِ مقابل کو توپ و تفنگ سے دھمکا کر اپنی بات منوانے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے مشورہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کسی کی ثالثی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی ان حرکات پر عقل ہنستی ہے، خرد ماتم کرتی ہے، شرافت شرماتی ہے، انسانیت مارے ندامت کے ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اسے ان میں سے کسی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ یا یوں کہیے کہ وہ جذبات، قوت کی بدمستیوں کے نیچے اس طرح دب جاتے ہیں

جس طرح شراب کے نشہ سے انسان کے ہوش وحواس پر پردہ پڑجاتا ہے. (کہ خمر کے معنی ہی ڈھانپنے والی شئے کے ہیں).
سوال یہ ہے کہ کیا ایسے انسان کو ان حالات میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے؟ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کا بد سے بد تر انسان بھی یہ نہیں کہے گا کہ ہاں! ایسے انسان نما درندے کو کھلا چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ نیسانِ ہستی میں اپنے فتنہ وفساد کی چنگاریاں پھینکتا پھرے، اور اس طرح امنِ عالم اور فلاحِ انسانیت کو پھونک کر راکھ کا ڈھیر بنادے. انسانی معاشرے کے آئین وضوابط نے ایسے انسان کے لئے انتظام کر رکھا ہے. اگر وہ طبعی طور پر فاتر العقل ہوچکا ہے تو اُسے پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے، اور اگر اس کی عقل وخرد ہی اُسے ان فساد انگیزیوں پر ابھارتی ہے تو اسے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ انسانیت اس کے دندانِ حرص وآز اور ناخنِ جور واستبداد سے محفوظ رہ سکے. پولیس اور عدالت اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے.

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک فرد کے بجائے، ایک قوم (یا مملکت) اسی طرح عقلی توازن کھو بیٹھے اور اپنی حقیقی یا مزعومہ قوت کے نشہ میں کسی دوسری قوم یا مملکت کے جائز حقوق کو غصب کرنا چاہے، اور اسے جینے تک کا حق نہ دے تو اس کا کیا علاج کیا جائے؟

اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے وہ قوت چھین لی جائے جو اس کی ان بدمستیوں اور فتنہ انگیزیوں کا باعث بن رہی ہے لیکن قوت بغیر قوت کے چھینی نہیں جاسکتی. ان حالات میں قوت کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے. دونوں قوتوں کے اس تصادم کا نام جنگ ہے. قوتیں دونوں طرف ہیں. لیکن غور کیجئے کہ ایک قوت کس مقصد میں صرف ہو رہی ہے اور دوسری قوت کس مطلب کے لئے!

یہی ہے وہ مقام جہاں قرآن جنگ کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے.

○

قرآن کے نزدیک انسانی زندگی بیش بہا متاع ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے. وہ اس حفاظت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

......مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (۵/۳۲)

جس نے کسی جان کو قتل کر ڈالا، بجز اس کے کہ اس سے مقصود قصاص لینا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے والوں کو سزا دینا، تو یوں سمجھو گویا اُس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا.

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ جب کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ (جسے قوم یا مملکت کہا جاتا ہے) وحشت اور درندگی کے اس مقام تک جا پہنچے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو نوعِ انسانی کی بہبودِ کلی کے لئے، اس انسانیت کے مجرم انسان یا قوم کے خلاف قوت استعمال کرنا اسی طرح (طوعاً وکرہاً) ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح جب کسی انگلی کا ناسور یکسر لاعلاج ہو جائے اور اس کا زہر باقی حصہ جسم کو بھی موت کی طرف لے جا رہا ہو، تو باقی جسم کو اس زہر سے بچانے کے لئے اس زہر آلود انگلی کو کاٹ کر الگ کر دینا نہ صرف جائز بلکہ جسم کی بہبودِ کلی کے لئے لاینفک ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد پورے کا پورا جسم زہر آلود ہو کر قبر میں جا پہنچے گا، اور اس کے ساتھ ہی وہ انگلی بھی ختم ہو جائے گی جسے کاٹ کر الگ کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو صرف ناکارہ انگلی ہی نے ختم ہونا تھا، لیکن اب انگلی کے ساتھ پورا جسم بھی تباہ ہو گیا۔

انسانی معاشرے کو اس قسم کے زہر سے متاثر کرنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں "فتنہ و فساد" ہے جسے وہ (انگلی اور جسم والی مثال کے مطابق) قتل سے بھی زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن قرار دیتا ہے۔ اس لئے اس کا ارشاد ہے کہ اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ یعنی" فتنہ و فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔" لہٰذا وہ فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے قوت کا استعمال ناگزیر سمجھتا ہے۔ یعنی فتنہ برپا کر دینے والی قوت کو زیر کرنے کے لئے قوت کا استعمال، تاکہ انسانی معاشرہ اس کی شر انگیزیوں سے محفوظ رہے۔ غور کیجئے، قرآن نے اس حقیقت کو کیسے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قوت صرف اُس وقت تک استعمال کرنی چاہیئے جب تک وہ شر انگیز اور فتنہ پرور قوت سپر انداز نہ ہو جائے۔ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا (۴۷/۴) "یہاں تک خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔" یعنی جس مقصد کے لئے یہ جنگ ناگزیر ہو گئی تھی وہ مقصد حاصل ہو جائے، اور انسانی معاشرہ سرکش قوتوں کی فساد انگیزیوں سے محفوظ ہو جائے۔ چونکہ اس تادیبی عمل میں کسی انتقام یا غصے کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ یہ کاروائی ایک ڈاکٹر کے آپریشن کی سی ہوتی ہے اس لئے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جونہی اس سرکش قوت کے متعلق دیکھو کہ وہ اپنی قہرمانیت و فرعونیت کو چھوڑ کر آمادہ تسلیم و رضا ہو رہی ہے، اُسے فوراً اپنے دامنِ عافیت میں لے لو۔ وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا اس تادیبی کاروائی کے دوران میں بھی نگاہ اس مقصد کی طرف رہے جس کی خاطر یہ ناگزیر قدم اٹھایا گیا ہے۔ یعنی اندھی قوت کی سرکشی کو درست کرنے کی طرف۔ اسی لئے نبی اکرمؐ ایسے مواقع پر ہمیشہ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ کسی بوڑھے

کہ بچے کو اور عورت کو قتل نہ کرو (ابوداؤد) اسی طرح غیر محارب آبادی کو بھی ناحق تنگ کرنے کی بھی ممانعت فرمادی۔ ابوداؤد میں حضرت انس جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں کسی غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ تھا۔ لشکریوں نے فریق مقابل کے پڑاؤ پر جاکر انھیں تنگ کیا' لوٹا' مارا۔ حضورؐ نے فوراً منادی کرادی کہ جو شخص غیر محارب آبادی کے گھروں میں گھس کر انھیں تنگ کرے یا لوٹ مار کرے اس کا جہاد قبول نہیں۔ اس طرح کی لوٹ کھسوٹ کا مال بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ابوداؤد میں ایک انصاری کا بیان ہے کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے۔ لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انھوں نے کچھ بکریاں لُوٹ کر انھیں ذبح کر لیا اور گوشت کی ہانڈیاں چڑھادیں۔ حضورؐ کو خبر ملی تو آپؐ تشریف لائے اور جو کمان ہاتھ میں تھی اُس سے سب ہانڈیاں اُلٹ دیں اور فرمایا کہ لُوٹ کی چیز مردار سے بھی بڑھ کر حرام ہے۔ اسی طرح دشمن کے قاصدوں سے کبھی بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔ اسیرانِ جنگ سے اپنے مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے اسیرانِ بدر کو صحابہؓ کے حوالے کیا ہے تو تاکید فرمادی کہ انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گزارا کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اسیرانِ جنگ کے علاوہ دشمن کا جو آدمی مسلمانوں سے پناہ طلب کرلے اُس کی پُوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ اس لئے کہ جنگ سے مقصود انتقام جوئی یا ہوسِ خون آشامی یا جوع الارض کی تسکین نہ تھی، بلکہ انسانی معاشرے میں آئینِ عدل واحسان کا قیام تھا۔ اس حقیقت کو حضورؐ نے نہایت جامع الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد راہِ خدا میں سمجھا جائے گا؟ حضورؐ نے فرمایا کہ من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ العلیا "جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا قانون غالب رہے' اس کا لڑنا جہاد ہے۔" اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ "تاکہ دین سب خدا کے لئے ہوجائے۔"

○

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قوت کے استعمال کی نوبت اُس وقت آئے گی جب باہمی افہام وتفہیم کے ذریعے' تصفیۂ معاملات اور اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام رہ جائیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب دو افراد کے درمیان جھگڑا یا اختلاف ہو تو عدالت ایک حَکم (ثالث) کی حیثیت سے فیصلہ دے دیتی ہے جس سے وہ جھگڑا طے ہوجاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جھگڑا یا اختلاف دو قوموں کے درمیان ہو تو اُس وقت کیا کیا جائے؟

قرآن نے اس ضرورت کو بھی سامنے رکھ لیا تھا' اس لئے اس کا حل بتادیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ دنیا میں

کسی ایسی جماعت کا وجود نہایت ضروری ہے جو تمام اقوامِ عالم کی نقل و حرکت اور اعمال و کردار کا محاسبہ کرتی رہے اور اختلافی مواقع پر باہمی طے شدہ آئین وضوابط کے مطابق فیصلے کرے اور ان کی خلاف ورزی کے اقدامات کو روکے (تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) قرآن نے اس جماعت کا نام اُمّتِ مسلمہ رکھا تھا۔ یعنی دنیا میں امن وسلامتی کی ضامن جماعت. اور اس کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے اس فریضہ محاسبۂ اعمالِ اُمم میں اس انداز سے جادۂ حق وعدل پر قائم رہے گی کہ دنیا کی ہر قوم اس سے برابر کے فاصلے پر ہو گی. اس خصوصیت کی حامل قوم کو "اُمّتِ وسطیٰ" کہتے ہیں. چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں "اُمّتِ وسطیٰ" بنایا ہے تاکہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال وکردار کے نگران رہو اور تمہارے اعمال وکردار کا نگران تمہارا مرکزِ نظامِ خداوندی ہو.

ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو سرانجام دینے والی جماعت کے پاس اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ ہی کو محفوظ ومصئون رکھ سکے بلکہ دیگر اقوام سے بھی اپنے فیصلوں کو منوا سکے. جس عدالت کی پشت پر قوتِ نافذہ نہ ہو اُس کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے محض وعظ بن کر رہ جاتے ہیں. دین اور مذہب میں یہی فرق ہے. مسلمان صدیوں سے دین سے محروم ہو چکا ہے اور مذہب کے فریب میں مبتلا ہے. نتیجہ اس کا یہ کہ نہ صرف یہ خود ہی نکبت وزبوں حالی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دنیا کی ہر متغلب قوت کے سامنے سپر انداز ہے بلکہ اس کی وجہ سے دنیا "اُمّتِ وسطیٰ" سے بھی محروم ہو چکی ہے جس کا فریضہ "شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" (تمام نوعِ انسانی کی نگران) تھا. اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا فتنہ وفساد کا جہنم بن چکی ہے. سرکش اور بیباک قوتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور کمزور کے لئے رونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا. چونکہ دنیا میں اُمّتِ وسطیٰ کا وجود نہیں رہا اس لئے شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" کا فریضہ "کفن چوروں" کے سپرد ہو چکا ہے. اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا. جہاں خدا کا قانون عمل پیرا نہیں ہوتا وہاں ابلیسی نظام کی بساط بچھ جاتی ہے، کیونکہ

خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں

یہ وجہ ہے کہ وہ اُمّت جسے اُمّتِ وسطیٰ بننا تھا اپنے فریضہ کو فراموش کر کے نہ صرف اپنے جرائم ہی کی سزا

بھگت رہی ہے، بلکہ دنیا بھر کے جرائم کی پاداش میں بھی بالواسطہ شریک ہے. رات کو سو جانے والے چوکیدار کے نہ صرف اپنے کپڑے ہی چوری ہو جاتے ہیں بلکہ وہ صبح اُٹھ کر محلّہ والوں سے پٹتا بھی ہے.

لیکن اگر وہ صرف سویا ہوا ہی ہے مر نہیں چکا تو اس کی بھی اُمّید کی جاسکتی ہے کہ وہ چوروں کی آہٹ پاکر اُٹھ بیٹھے، اور اس طرح اپنی متاع بھی محفوظ کرلے اور جن کی حفاظت اس کے سپرد تھی ان کی متاعِ حیات بھی محفوظ رہے.

خدا کرے کہ ہم زمانے کے تھپیڑوں سے جاگ اُٹھیں اور ہمارے جاگنے سے چور بھاگ جائیں اور شریف انسان اطمینان کی نیند سو جائیں.

فردوسِ گم گشتہ

(اپریل ۱۹۴۱ء)

۲۲/۲۳ فروری ۱۹۴۱ء کو مجلسِ تاریخ و تمدن کی دعوت پر دار العلوم علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وقت بہت کم تھا اور مشاغل بہت زیادہ۔ بایں ہمہ ایک تیرتی ہوئی نگاہ سے جو کچھ وہاں دیکھ سکا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ قوم کے نوجوانوں میں قرآن کریم کی طرف ایک خاص رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اور اگر انھیں قرآن کی صحیح تعلیم سے روشناس کرا دیا جائے تو اُن کے ساتھ بہت سی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ طلباء اور حضراتِ اساتذہ کے اجتماع میں پڑھا گیا۔ (پرویز)

کائنات کی ہر شے ایک ملے بندھے قانون کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ریت کے ذرہ سے لے کر عظیم الشان کرۂ ارض تک۔ اس کرہ سے کئی لاکھ گنا بڑا سورج مع اپنے محیّر العقول نظام کے۔ اور پھر اس نظام شمسی جیسے لاتعداد اور نظامِ اجرامِ سماوی، سب ایک متعینہ قاعدہ کے مطابق اپنے اپنے فرائضِ مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ اگر زمین اپنے راستہ سے کبھی ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی کرلے۔ اگر ہوائیں اپنے رُخ کو طرفۃ العین کے لئے خلافِ قاعدہ بدل لیں۔ اگر پانی اپنی فطرت کے خلاف نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ غرضیکہ اس مشینری کا کوئی ایک پُرزہ اپنے نظام سے سرتابی اختیار کرلے، تو یہ عظیم الشان کائنات ایک سیکنڈ میں درہم برہم ہوجائے اور یہ تحیّر انگیز کارگہِ حیات مٹی کا گھروندہ بن کر رہ جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں، دنیا اور اس کی تمام نُدرت آفرینیاں محض اس بناء پر قائم ہیں کہ فطرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ اس حیرت خانۂ امروز و فردا کا ہر ایک پُرزہ اپنے دائرۂ عمل میں پوری مستعدی سے سرگرمِ عمل ہے۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا

فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ ہر شئے خدا کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ۔

ذرّہ ذرّہ دھر کا زندانیٔ تقدیر ہے

جب عالمِ موجودات کی ہر شئے اس محکم اور غیر متبدّل قانون پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان، جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے، جو نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے، وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہوگا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بزمِ سخن میں ہر شعر، عروض و قوافی کی حدود سے گھرا ہوا ہو۔ لیکن حاصلِ مشاعرہ ربط و ضبط کی ان پابندیوں سے آزاد ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لے کر کونپل تک درخت کا ایک ایک حصہ اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں قاعدے اور قانون کا پابند ہو، لیکن پھل ہر اصول سے بے نیاز ہو؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

قانون کی اطاعت

جب کائنات کی ہر شئے ایک خاص نہج اور اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے، تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص قانون کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ قانونِ حیات جس کے مطابق انسان کے لئے زندگی بسر کرنا تقاضائے شرفِ انسانیت ہے، اسلام کہلاتا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ
الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ (۳۰/۳۰)

خدا کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اُس نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی دینِ محکم ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس (حقیقت) کو نہیں جانتے۔

لیکن انسان اور فطرت کی دوسری چیزوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ دیگر اشیائے فطرت اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لئے متعیّن کیا گیا ہے۔ انھیں اس قانون کی تعمیل و عدمِ تعمیل میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ انھیں جو حکم دیا گیا ہے اس میں انھیں مجالِ سرتابی نہیں، یارائے سرکشی نہیں۔ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۔ لیکن برعکس اس کے انسان کو اس معاملہ میں اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔

انسانی اختیار و ارادہ

اسے آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے متعیّن کیا گیا ہے۔ اور چاہے اس کی خلاف ورزی کرے۔ اسے زندگی کے دوراہے پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں نہایت جلی حروف میں سائن پوسٹ نصب ہیں۔ سامنے عقل و فکر اور شعور و ادراک کی شمعیں فروزاں ہیں، جن کی روشنی میں سائن پوسٹ پڑھ کر یہ دونوں راستوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ جس راہ پر چاہے گامزن ہو جائے۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ

إِمَّا شَاكِرًا وَّ إِمَّا كَفُورًا ۔ اختیار و ارادہ کا یہی امتیاز ہے جس سے انسان دیگر مخلوق کائنات کے مقابلہ میں اشرف و اعلیٰ ہے۔ یہی قوتِ تمیز اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک و مخدومِ خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے، اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے۔ اور جامِ زندگی کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اُٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموج سے، اور اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی کے تحرک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت۔ اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بُت ہوتا۔ یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ۔ مسجودِ ملائک اور مسخر کائنات کبھی نہ ہوتا۔ قصۂ آدم کا پہلا باب اسی اختیارِ ارادہ کے مظاہر سے شروع ہوتا ہے جو معصیتِ آدم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد نہ ہو۔ نیازمندی اُسی کی قابلِ ستائش ہے جو سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے جُھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہیں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے تختِ حکومت نہیں، اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار میں جبر ہی وجۂ شرفِ انسانیت ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکامِ خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ لیکن اگر یہی اختیار و ارادہ آئین و ضوابط کے ساحلوں میں پابند نہ ہو جن کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنا تقاضائے انسانیت ہے تو اس دیوبے زنجیر کی حدود فراموش طوفان خیزیوں اور قیود ناآشنا سیلاب انگیزیوں کا کیا ٹھکانا! بھلا سوچئے کہ جو انسان کائنات کی ہر شے کو تابع فرمان کر لینے کی امکانی قوتیں اپنے اندر رکھتا ہو اگر وہ اپنی قوتوں کو آزاد چھوڑ دے تو دنیا کن ہولناک بربادیوں کا عبرت انگیز مرقع نہ بن جائے گی؟

یہی وہ خلافِ انسانیت آزادی تھی جس نے یورپ کے ان میدانوں کو جن کا ہر گوشہ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا حسین نظارہ در آغوش تھا، آگ اور خون کا ایسا جہنم بنا دیا ہے[1] جس میں انسانیت تڑپتی، پھڑکتی،

یورپ کی سرکشی

جھلستی، بلبلاتی، سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ یورپ نے اختیار و ارادہ کو ابلیسانہ سرکشی تو سکھا دی۔ لیکن ؏

---

[1] دوسری عالمگیر جنگ سے مراد ہے۔

عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

جس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

یہ آئین وضوابط جن کے ماتحت زندگی بسر کرنا باعثِ شرفِ انسانیت ہے' وحیٔ خداوندی کے باہر کہیں نہیں مل سکتے. کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ آئین وضوابط انسانی ذات کی بالیدگی کا باعث ہیں تو انہیں کسی خارجی ذریعے سے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ انھیں خود انسان کے اندر ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا؟ یہ درست ہے. لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کا دل پتھر کا بنا ہوا نہیں جس پر کوئی خارجی شئے اثر انداز نہ ہو سکے. جس چیز کو عام طور سے "انسانی فطرت" کہا جاتا ہے ذرا پوچھئے علم تجزیۂ نفس (PSYCHO ANALYSIS) کے ماہرین سے کہ اس کی کیفیت کیا ہے اور یہ کن خارجی اثرات ورجحانات کا مجموعہ ہوتی ہے. وراثت کے اثرات' ماحول کے اثرات' بچپن کی تعلیم وتربیت کے اثرات' قومی روایات کے اثرات. اور آگے بڑھئے تو ان اخلاط کے اثرات جن سے جسمِ انسانی ترکیب پاتا ہے. ان تمام اثرات کے بعد اندازہ فرمایئے کہ انسان کے اندر غیر ملوّث آواز کہاں باقی رہ سکتی ہے. ان اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ طبیعی ضروریات میں بھی "انسان کی فطرت[1]" صحیح راہ نمائی نہیں کر سکتی. مثلاً بکری کا بچہ بھوکوں مرجائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا. مرغی کے بچہ پر ہزار آفت آرہی ہو وہ پناہ جوئی کے لئے پانی کے حوض کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھائے گا. لیکن انسان کا بچہ سنکھیا کے ٹکڑے کو بھی اسی طرح بلا تکلف منہ میں ڈال لے گا جس طرح شکر کی ڈلی کو. وہ بلا تامل آگ میں ہاتھ ڈال دے گا. پانی کے حوض کی طرف لپک کر جائے گا. آپ کو قدم قدم پر اس کی حفاظت کرنی پڑے گی. سوجس متاثرہ "فطرت" کی آواز کا یہ عالم ہو کہ وہ حیوانی ضروریات میں بھی صحیح راہ نمائی نہ کر سکے' اُسے انسانی ضروریات کے لئے کافی سمجھ لینا وہی نتائج پیدا کرے گا جو آج یورپ میں پیدا ہو رہے ہیں. انسان کی راہ نمائی صرف اس مقام سے ہو سکتی ہے جو ان تمام خارجی اثرات سے بلند وبالا ہو اور اس کا تعین وہی ذات کر سکتی ہے جو انسانی جذبات ورجحانات اور امیال وعواطف سے منزہ ومبرّا ہو. یہ مقام' مقامِ وحی اور یہ ذات' ذاتِ خداوندی ہے. وہ ذات جسے انسانی

مقامِ وحی

---

[1] انسان کی کوئی فطرت نہیں. اس کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم. (پرویز)

ذات کے خالق ہونے کی حیثیت سے خوب معلوم ہے کہ کس قسم کے آئین وضوابط شرفِ انسانیت کی بالیدگی کے موجب ہیں اور کون سے اس کے خلاف۔ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ اس لئے جب انسان کو اس عالمِ اثرات وجذبات میں بھیجا گیا، کشمکشِ حیات اس کے لئے مقدر کی گئی، تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کر دیا کہ اس کی صحیح راہ نمائی کے لئے اسے آسمانی ہدایت بھی ملتی رہے۔ اس کے بعد اس سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ اگر اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہو گے تو تمہیں کسی قسم کا خوف وخطر نہیں ہوگا۔ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

علاوہ ازیں انسان اور دیگر مخلوق کے اسلوبِ زندگی میں ایک نمایاں فرق اور بھی ہے۔ باقی مخلوق کی زندگی انفرادی ہے۔ ایک کے اعمال کا دوسرے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لمبا چوڑا واسطہ نہیں ہوتا لیکن

انسان مدنی الطبع ہے

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اسے مل جُل کر زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے انسانوں کے مقاصد مشترک ہیں۔ ان کے معاملات باہمدگر پیوست ہیں۔ یہاں ایک کے اعمال سے قوم کی قوم اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر ایک مستبد قوت برسرِ اقتدار آجائے تو کروڑوں انسانوں پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کے مقدرات کسی صاحبِ عدل وانصاف کے ہاتھ میں آجائیں تو یہی جہنم جنت سے بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک بداخلاق، دق کے جراثیم کی طرح پوری کی پوری سوسائٹی کو ہلاکت و بربادی کے مہیب غار میں دھکیل سکتا ہے اور ایک خوش اطوار، نرگس ولالہ کی طرح، ساری محفل کو جہان رنگ و بو میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں زبردست انسانوں کے خون کی رنگینی کسی ایک بالادست کے عشرت کدہ کی زیبائش وآرائش کے کام میں لائی جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی قوتِ بازو لاکھوں کی روزی کی کفیل ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کی ہوسِ ستم رانی سے ہزاروں بے گناہ سینے گولیوں کا نشانہ بن جائیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی سپر لاکھوں مظلوموں کے لئے کاشانۂ امن بن جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت انسانوں کے لئے صرف وہی ضابطۂ حیات وجۂ امن وسکون اور باعث کامیابی وکامرانی ہو سکتا ہے جس کا دائرۂ عمل افراد تک محدود نہ ہو، بلکہ اس کے پیشِ نظر حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ کی اصلاح ہو۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ افراد کی اصلاح بھی اس لئے کرے کہ جو سوسائٹی ان کے مجموعہ سے متشکل ہوگی وہ ازخود اصلاح یافتہ ہو جائے گی۔ وہ مختلف پُرزوں کا جائزہ لے اور ان کے نقائص کو دُور کرے تاکہ جو مشین ان کے نظم ونسق اور تدوین وترتیب سے تیار ہو وہ ازخود اصلح واعلیٰ ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب انسان کے راستہ میں اس قدر خارجی اثرات اور اتنی متخالف قوتیں حائل ہیں، تو انسانوں کی ہدایت کے لئے محض ایک ضابطۂ قوانین ہی کافی نہیں ہوگا۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی

قانون کے ساتھ قوت

درکار ہوگی۔ کیونکہ قانون بلا قوتِ نافذہ ایک کتاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تعزیراتِ ہند، ہندوستان کے اندر ایک زندہ قانون ہے اس لئے کہ اس کے پیچھے ایک قوتِ نافذہ موجود ہے۔ لیکن یہی ضابطۂ قوانین، سرحد کے آزاد قبائل میں ایک عام کتاب سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ وہ علاقہ اس قوتِ نافذہ کے احاطہ سے باہر ہے۔ اس لئے قانون وہی زندہ کہلا سکتا ہے جس کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

لہٰذا جس خلاقِ فطرت نے انسانی رشد و ہدایت کے لئے ضابطۂ قوانین عطا فرمایا اس نے یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ اس قانون کی تنفیذ و ترویج کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین (کتاب) اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ نوعِ انسانی توازن پر قائم رہے اور ہم نے (ان چیزوں کی محافظت کے لئے) فولاد کی شمشیر بھی نازل کی جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت تاکہ اللہ یہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحب قدرت و تدبیر ہے۔

اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے ہدایتِ خداوندی اور اس قوتِ نافذہ کا حکومتِ الٰہی۔ اس ضابطۂ حیاتِ اجتماعیہ کی رو سے انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر بن جائیں جو دنیا میں قوانین خداوندی کے نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ اور دوسرے وہ جو اس کے ممبر نہ ہوں۔ آپ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس

دو جماعتیں

کے قوانین و ضوابط مرتب کرتے ہیں۔ اب ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط کا بغور مطالعہ کرے۔ اس کے بعد جی چاہے تو اس سوسائٹی کی ممبری (رکنیت) قبول کر لے

اور جی چاہے تو نہ کرے۔ اس پر کوئی جبر نہیں۔ لیکن جب آپ اُس کی رکنیت قبول کر لیتے ہیں تو اس کے بعد آپ پر لازم آجاتا ہے کہ اس سوسائٹی کے تمام قواعد وضوابط کا اتباع کریں۔ آپ کو یہ اختیار کبھی نہیں دیا جاسکتا کہ جس قاعدے کا جی چاہے اتباع کریں اور جس کی جی چاہے مخالفت کریں۔ جب تک آپ اس سوسائٹی کے ممبر ہیں آپ کو تمام وکمال قواعد وضوابط کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو رکنیت سے مستعفی ہو جائیے۔ اب رہے وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں۔ سو اُن پر ان قواعد وضوابط کا تمام وکمال اطلاق نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ یہ مجموعۂ قوانین، حیاتِ اجتماعیۂ انسانیہ کی اصلاح کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس لئے جن امور کا تعلق عام انسانیت سے ہے اُن سے متعلقہ قوانین کا اطلاق اُن پر بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سوسائٹی تپ دق کی روک تھام کے لئے متشکل ہوتی ہے۔ کچھ قواعد وضوابط تو ایسے ہوں گے جن کا اطلاق صرف اس سوسائٹی کے اراکین پر ہوگا۔ لیکن اس مرض سے متعلقہ امور کے حصّہ قوانین کا اطلاق ممبر اور غیر ممبر دونوں پر ہوگا۔ دق کے جراثیم جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے، اُن کے استیصال کے لئے ان ضوابط کے ماتحت ضروری کارروائی کی جائے گی اور ان قوانین

قانون کا نفاذ

کا نفاذ کبھی جبر نہیں کہلائے گا۔ یہ ایسا ہی جبر ہے جیسا ایک ڈاکٹر کسی مریض پر آپریشن کرنے میں "زبردستی" کرتا ہے۔ اسے پھر کوئی صحیح العقل زبردستی نہیں کہہ سکتا۔ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے روک لینا اُس پر زیادتی نہیں۔ کسی بچّے کے ہاتھ سے جبر چاقو چھین لینا اس پر ظلم نہیں۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کر کے اُس سے اُس کے اس اختیار کو سلب کر لینا ناانصافی نہیں۔ تو مفاد پرست گروہ کی مسخ شُدہ ذہنیت کو راہِ راست پر لانے کے لئے قوانینِ صحیحہ کا نفاذ بھی جور وتعدی نہیں کہلا سکتا۔ بالخصوص اس لئے کہ اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج، قوانین طبیعی کی طرح ایسے محسوس اور بدیہی نہیں ہوتے کہ انسان اس سے از خود اجتناب کرنے لگ جائے۔ مثلاً انسان کی زندگی کا مدار سانس پر ہے۔ ذرا اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مُنہ اور ناک بند کر لیجئے۔ خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ اس معصیت کوشی کا نتیجہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو حالانکہ یہ بھی اسی طرح باعثِ ہلاکت ہے جس طرح سانس روک لینا، لیکن اس معصیت کا نتیجہ محسوس طور پر اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ اس سے کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ وہ محسوس کرے یا نہ کرے، اس کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں جن کا مجموعی اثر غیر محسوس طور پر، انسان کی تمدنی، عمرانی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی سیاسی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی قالب میں ڈھال

دیتا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل وانصاف یہی ہے کہ انسانوں کو اس معصیت کوشی سے روکا جائے، جس کے اثرات اس قدر دُور رس اور عالمگیر ہوں۔ یہ انسان کے اختیارات کو کچل دینا نہیں ہوگا' فقط اُن کی تحدید ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نظامِ معاشرہ تحدید ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ اگر کسی کا پاؤں زہر آلود ہوجائے تو اس کی پنڈلی کو ایسا کس کر باندھ دیا جاتا ہے جس سے اوپر کا حصّہ زہر کے اثر سے فی الجملہ محفوظ ہوجائے۔ اور اگر ڈاکٹر دیکھے کہ زہر کا اثر اس سے بھی نہیں رُکتا' اور اندیشہ ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ باقی حصّہ جسم بھی متاثر ہوجائیگا تو وہ جسمِ انسانی کے کُلّی مفاد کی خاطر پاؤں کاٹ ڈالتا ہے۔ یہی وہ تحدید و تادیب ہے جس سے حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ خلافِ انسانیت اعمال کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور یہ تحدید اسی صورت میں ممکن ہے کہ قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو۔ اس قوتِ نافذہ کی اطاعت کسی غیر کی غلامی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہوگی۔ یہ کسی انسان کے سامنے جُھکنا نہیں ہوگا جس سے انسانی خودی کا آئینہ چکنا چُور ہوجاتا ہے' بلکہ قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت ہوگی جس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔

جبر واطاعت کی اس لِم کو پیشِ نظر رکھئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اصلاحِ انسانیت کا یہ نظام کس انداز سے قائم کیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ

قرآن اور قوت

التزام بھی کردیا کہ جس جماعت کے ہاتھوں اس کے قوانین کا نفاذ ہو' اسے خلافتِ ارضی سے بھی سرفراز کیا جائے تاکہ اس ضابطۂ الٰہی کو ایک زندہ قوت کی حیثیت حاصل ہو۔ یہ محض نظری مسائل کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائے۔ قوت' اس قانون کی محافظ ہو اور قانونِ خداوندی اس قوت پر ایسا ضبط اور (CONTROL) رکھے کہ یہ کہیں ناجائز استعمال نہ ہوسکے۔ قرآن اور قوت نہ صرف لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کے محافظ بھی۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

اگر آپ قرآنی حقائق پر غور فرمائیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ خدائے حیّ و قیوم کا وہ ازلی پیغام جو حضراتِ انبیائے کرام کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا' اس باب میں اس کا شروع سے ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لِم رہی۔ یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو انسانوں میں دولت و قوت کی زیادتی اور ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو

اُبھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے، اور اس کے ساتھ ہی انھیں ایسی حیات پرور تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں یہ عیوب پیدا نہ ہوں جو قوت کے غلط استعمال سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ قوانینِ الٰہیّہ سے مُنہ موڑنے والے انسانوں سے قوت چھین کر ان لوگوں کو دے دیتے تھے جو اس کا استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق کریں اور اس طرح دنیا میں نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامّہ کا نظام قائم ہو جائے۔ بس یہ ہے خلاصہ اس آسمانی تعلیم کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی، اور جس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سُرخروئی ہے۔ یہ میزانِ خداوندی کے دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار ہونے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اُڑنے والے شاہین کے دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے اُبھر نہیں سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی فضائیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدوسیوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ اور اُممِ سابقہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے، یہ حقیقت اُبھر کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ زیادہ نہیں تو ایک سورۂ اعراف ہی کو دیکھئے۔ حضرت

سابقہ انبیائے کرامؑ

نوحؑ کے بعد جہاں، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیب علیہم السلام کے سلسلۂ رشد و ہدایت کا ذکر ہے، وہاں اُن کی اقوام کے متعلق بصراحت موجود ہے کہ انھیں سطوت و اقتدار اور حکومت و قوت کی نعمتوں سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ سلسلۂ انبیاء کرامؑ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس مقدّس گھرانہ کے متعلق صریحاً فرمایا کہ انھیں کتاب و حکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے تمکن فی الارض کا حیات پرور تذکرہ احسن القصص کے تابندہ عنوان سے قرآنِ کریم کے صفحات پر جگمگاتا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان، اسی قوت و حشمت اور تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس انداز سے جاری تھا کہ حضرات انبیائے کرامؑ خاص وقت اور خاص اقوام کے لئے تشریف لاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا پیغام یا تو بھلا دیا جاتا، یا اس میں الحاق و تحریف کر دی جاتی۔ اس کے بعد پھر ایک نئے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ شعور کو پہنچ گئی۔ انسانیت پر شباب آگیا۔ اب وہ وقت تھا کہ انسانوں کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جاتا جو اُن کی قیامت تک کی ضروریات کے لئے کافی ہو جاتا، اور اس ضابطۂ قوانین کو محفوظ و مصئون رکھا جاتا۔ یہ ضابطۂ قوانین ملا اور اس کے ساتھ ہی

اس کی حامل جماعت کو ایسی سطوت و اقتدار کی زندگی عطا ہوئی جس کی مثال اممِ سابقہ میں کہیں نہیں ملتی. قدوسیوں کی اس جماعت کے ہاتھوں، خدا کی حکومت کا تختِ اجلال اس زمین پر بچھایا گیا اور ان تمام

قرآن

بندشوں کے طوق و سلاسل توڑ دیئے گئے، جن کے نیچے انسانیت صدیوں سے دبی چلی آتی تھی. یہی مشیت کا منشا رتھا. یہی پیغامِ خداوندی کا مقصود تھا. یہی انسانیت کی معراج تھی. اس تکمیلِ نعمت اور اتمامِ دین کے بعد نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

○

رسولؐ اللہ کے بعد

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس نظام کو آگے چلانے کی کیا صورت اختیار کی گئی جو اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے چلایا جا رہا تھا. فرمایا۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کر لیا.

اور وراثتِ کتاب کے ساتھ ساتھ انہیں حکومت و مملکت کا بھی وارث بنا دیا. سورۂ احزاب میں ہے کہ "اس لے تمہیں (حق کے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا. اور ان زمینوں کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم نہ پہنچے تھے." اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح کر دی کہ یہ محض اتفاقی حادثہ نہ تھا جس سے تمہیں شوکت و سطوت مل گئی بلکہ یہ ہمارا ٹھیرایا ہوا قانون ہے. سورۂ نور میں ہے کہ "جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پیشتر اس نے (ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو) حکومت عطا فرمائی تھی. وہ ان کے اس دین کو جو اُن کے لئے منتخب کیا گیا ہے، متمکن کر دے گا اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا، تاکہ وہ صرف اللہ ہی کے محکوم ہوں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں." وارثینِ کتاب کی جماعت کا فریضۂ حیات کیا ہوگا؟ فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"تم وہ بہترین قوم ہو جو نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہو. تمہارا فریضۂ زندگی یہ

ہے کہ تم قوانینِ الٰہیہ کا حکم عام کرو اور لوگوں کو اس کی خلاف ورزی سے روکو۔"

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ اسلام کے تین عناصرِ ترکیبی لاینفک ہیں۔

اوّل۔ ضابطہ قوانینِ الٰہیہ

دوم۔ قوتِ نافذہ۔ اور

سوم۔ ان دونوں کی حامل جماعتِ مؤمنین یا حزب اللہ۔

اس قدسی دَور کے بعد جس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے، قوتِ نافذہ کس طرح پہلے مسخ اور پھر معدوم ہوگئی، یہ داستان بڑی الم انگیز ہے اور اس کا دُہرانا بڑا دل خراش۔ لیکن قوت کا مٹ جانا اتنا درد انگیز نہیں تھا جتنا قلب و دماغ سے حیاتِ اجتماعیہ کے اسلامی تخیل کا محو ہو جانا۔ آج جب حقیقت بیں آنکھیں اس محرومی پر نگاہ ڈالتی ہیں تو فرطِ حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں کہ پیکرِ اسلام کا یہ بنیادی عنصر کس طرح عجمی

حیرت انگیز انقلابِ معکوس

تصورات کے رنگین پردوں میں چھپ گیا جس کی وجہ سے اسلام اپنے مقامِ بلند سے اُتر کر عام انسانی مذاہب کی طرح انفرادی نجات اور ذاتی تزکیۂ نفس کا ذریعہ بن کے رہ گیا، اور یوں مسلمانوں کے رگ و پے میں وہ رہبانیت عملاً سرایت کر گئی جس کے خلاف اسلام ایک کھلی ہوئی بغاوت تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلام نفوس کا تزکیہ اور افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ ان کے مجموعہ سے جو جماعت تیار ہو وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ اس کے نزدیک ایک پُرزہ خواہ کتنا ہی پختہ اور درست کیوں نہ ہو، اگر کہیں اکیلا پڑا ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی قیمت صرف اس وقت ہے جب وہ مشین میں اپنے صحیح مقام پر فٹ ہو اور اس کی ہر حرکت دوسرے پرزوں پر بایں نمط اثر انداز ہو کہ ان تمام پُرزوں کی حرکت کا مجموعی نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ اگر آپ کتاب و سنت اور تاریخ و آثار پر نگاہ ڈالیں تو اس حقیقتِ باہرہ کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہ پڑے کہ اسلام نام ہی جماعتی زندگی کا ہے۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اسلام کا تصور ہی غلط ہے۔ لہٰذا ایک دیدۂ بینا کے لئے خون کے آنسو رونے کا مقام وہ نہیں جہاں اسے مسلمانوں کی لٹی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی شوکت یاد آئے۔ بلکہ وہ مقام ہے جہاں اُسے یہ نظر آئے کہ اسلام جیسا حیاتِ اجتماعیہ کا دین کس طرح محض انفرادی اصلاح کا نظریہ تصور کر لیا گیا۔

جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن نامساعد حالات میں ہم گرفتار ہیں، ان کے پیشِ نظر کیا ہم مایوس ہو جائیں اور سمجھ بیٹھیں کہ اب کوئی فرشتہ ہی آسمان سے اُترے

پس چہ باید کرد

تو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو سکے؟ یہ خیال بڑا غلط اور حقائق سے چشم پوشی پر مبنی ہوگا۔ اسلام جن تین عناصرِ خصوصی سے مرکّب ہے، ان میں سے ایک، اور سب سے اہم عنصر، ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ یعنی ضابطۂ خداوندی، جسے قرآنِ کریم کہا جاتا ہے، ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کے ساتھ اسی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں اُسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا تھا۔ اس ضابطۂ الٰہی کی موجودگی میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری قومیں اس لئے گر کر نہ اُبھر سکیں کہ اُن سے ہدایتِ خداوندی گم ہو چکی تھی۔ ہماری حالت ان سے اس باب میں مختلف ہے۔ جس حالت میں ہم آج گرفتار ہیں، قرآن کریم اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وراثتِ کتاب کی وہ آیۂ جلیلہ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ
وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (۳۵/۳۲)

"پھر ہم نے وراثتِ کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے (ایک جماعت کو) منتخب کر لیا (ان کے تین مدارج ہو گئے) ایک اپنے آپ پر ظلم کرنے والے، ایک درمیانی روش والے اور ایک اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔"

یہ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کا درجہ وہی ہے جس سے ہم آج گزر رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کیا وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو جاتے ہیں؟ کیا وہ زندگی سے ابدی طور پر محروم کر دیئے جاتے ہیں؟ کیا ان کے لئے مایوسیوں کی ظلمت ناک گھٹاؤں میں اُمید کی کوئی کرن باقی نہیں رہتی؟ قرآن سے ان سوالات کا مایوس کُن جواب نہیں ملتا۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اس جنتِ ارضی سے نکال دیئے گئے جو ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کیفیت کو قرآنِ کریم قصۂ آدم میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ "آدم" اپنی لغزش کی وجہ سے جنت کے مقامِ بلند سے نیچے گر گیا۔ جب اُسے اس پستی کا احساس ہوا تو عرض کیا کہ:۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۷/۲۳)

"اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا. اگر تو ہماری حفاظت کا سامان بہم نہیں پہنچائے گا
تو ہم خاسر و نامراد رہ جائیں گے"

یہ وہی "اپنے آپ پر ظلم کرنا" ہے جس کا ذکر ابھی ابھی آیۂ وراثتِ کتاب میں کیا جا چکا ہے. اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ چھنی ہوئی جنت دوبارہ مل سکتی ہے. اور اس کی بازیابی کا طریقہ یہ ہے کہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

"جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کا اتباع کرے گا
اُسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا"

یہ ہدایت ہمارے پاس موجود ہے، اس لئے ہم اس جہنم کی پستی سے اُبھر کر پھر اسی جنت کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم گرے تھے. آدم کی لغزش، ابلیس کی لغزش نہیں جس میں گر کر پھر اُبھرنا نہیں. ٹوٹ کر پھر بننا نہیں. ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اس کی سزا بھگت رہے ہیں. لیکن

آخر گناہ گار ہیں کافر نہیں ہیں ہم

جب ابدی مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی کیا سبیل ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں. جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، ہماری نشاۃِ ثانیہ کے دو اجزاء لاینفک ہیں. قرآنِ کریم سے تمسک اور جماعتی زندگی کے تخیل کا احیاء. قرآنِ کریم ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہماری عملی زندگی میں اس کا حصہ اتنا ہی رہ گیا ہے کہ

از نیں او آساں بمیری

حالانکہ خدائے زندہ کی یہ کتاب زندہ یکسر زندگی بخش ہے. ایسا ضابطۂ قوانین ہے جس کا ایک ایک لفظ سرتاپا حق و یقین ہے وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ. جس میں کہیں، کسی جگہ، شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش. لَا رَيْبَ فِيْهِ. ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا. حق کہتے ہی اُسے ہیں جو ثابت ہو، اٹل ہو، اَمِٹ ہو، اپنی جگہ پر قائم ہو، حقیقت کے ہر معیار پر پورا اُترے، علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو. اس کے برعکس باطل وہ ہے جو مٹ جانے والا ہو، جو باقی نہ رہ سکے. قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے، باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں. علم و دانش ہے، توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں. کسی خاص قوم اور خاص جماعت

کی ہدایت کے لئے نہیں. بلکہ نسلی، لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی، غرضیکہ انسانوں کی خود ساختہ تمام حدود و قیود کو توڑ کر، تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئینِ حیات ہے. عدالتِ خداوندی کے منبر پر آج قرآن کے علاوہ اور کوئی ضابطہ نہیں، جس کے مطابق اقوامِ عالم کی موت وحیات کے فیصلے ہوتے ہوں. پھر جس طرح یہ صحیفہ خداوندی مکانی حدود سے بلند ہے، اسی طرح زمانی قیود سے بھی ناآشنا ہے. یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں بھی یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی طرح قرآنِ کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا، اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو.

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

زمانہ، علم وعقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتا چلا جائے، قرآن کریم اس سے بھی دس قدم آگے نظر آئے گا. اس لئے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں. نیز قرآن کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ضابطہ قوانین ہے. مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب، معاشرت، معاشیات، غرضیکہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر اصولِ ہدایت موجود نہ ہوں. وہ اصولِ ہدایت جن پر عمل کر کے ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارا کرنے والی، قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر وکسریٰ کی دولت وسلطنت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف دنیائے جہانداری وجہانبانی میں مکارمِ اخلاق کے اس مقامِ بلند تک پہنچ گئی جسے چشمِ فلک نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے. قرآنِ کریم کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے محض خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں کہا. بلکہ بتوفیقِ ایزدی علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے. آج کے مسلمان نے بہت کم سمجھا ہے کہ قرآن ہے کیا!

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود | جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

لہٰذا آج ہمارے لئے سب سے پہلا مرحلہ قرآنِ کریم کو اپنی عملی زندگی میں راہنما بنانا ہے. اور دوسری چیز اجتماعی زندگی کا تخیل ہے. ان دونوں کے امتزاج (یعنی ایمان واعمالِ صالح) کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا. لیکن یہ کیفیت ایک دن میں پیدا نہیں ہوسکتی. آدم کو دوبارہ جنت حاصل کرنے کے لئے جن تدریجی مراحل سے گزرنا

پڑا ہے۔ ان ہی منازل کو ہمیں بھی طے کرنا ہوگا۔ ہم پہلی ہی جست میں اس مقامِ بلند تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انقلاباتِ زمانہ کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے جی بھی چاہتا ہے کہ ہم میں یہ تبدیلی کسی طرح آج ہی پیدا ہو جائے۔ ہم رات کو موجودہ حالت میں سوئیں اور صبح اُٹھیں تو ہمارے گرد و پیش عہدِ فاروقیؓ کا ماحول کھڑا ہو۔ یہ آرزوئیں بڑی مقدس ہیں، لیکن ان کا تعلق عملی دنیا کے بجائے عالمِ تصور سے ہے۔ آپ کی بیتابی تمنا بجا اور درست، لیکن عملی دنیا میں آپ کو ان تمام ارتقائی مدارج سے گزرنا ہوگا جن سے قطرہ کو گوہر بننے تک گزرنا پڑتا ہے۔ ہماری اصلاح کے ابتدائی مراحل ایسے غیر محسوس ہوں گے کہ بظاہر ان میں اصلاح کا شائبہ بمشکل نظر آئے گا۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کر کے کہ اصلاح تو وہی قابلِ اعتنا ہے جس میں پہلا قدم آخری زینہ پر ہو، زینہ چھوڑ کر بیٹھ جائیں، تو اس سے ہم اپنی موجودہ سطح سے ایک انچ بھی اوپر نہیں اُٹھ سکیں گے۔ لہٰذا آج جو قدم مسلمانوں میں انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی پیدا کرنے کے لئے اٹھے[1]، اور جو آواز انہیں نظامِ قرآنی کی طرف دعوت دے، مبارک ہے۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کا ساتھ دینا باعثِ سعادت۔ اور یوں ساتھ رہ کر اصلاح و ارشاد کے پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا موجبِ رحمت۔ اگر آج مسلمانوں نے اس نقطہ کو سمجھ لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے تو رفتہ رفتہ اُن کی لُٹی ہوئی تزدہیں، چھنی ہوئی دولتیں، اور مٹی ہوئی عظمتیں ایک ایک کر کے اُن سے ہم کنار ہو جائیں گی، اور خاک کے ذرّے پھر ایک دوسرے سے کہیں گے کہ

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد

---

[1] یہ مقالہ اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب تحریکِ پاکستان کا ابتدائی دور تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی کے احساس کو بیدار کرنا وقت کی اہم ضرورت۔ ویسے، یہ ضرورت آج بھی کچھ کم نہیں۔

ایمانِ بلا عمل

(جولائی ۱۹۴۱ء)

قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بھی اپنے اندر عجیب سامانِ موعظت رکھتی ہیں۔ ان کے بڑھنے اور اُبھرنے کے زمانہ کو دیکھئے، نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم (ایمان) اور اس کے حصول کی خاطر تگ و تازِ مسلسل (عمل)۔ زندگی کی ساری کہانی دو لفظوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ دلوں میں ولولے، خون میں حرارت، آنکھوں میں چمک، سارا ماحول زندگی سے بھرپور، خاک کے ایک ایک ذرّے میں نویدِ حیات درخشندہ، مصائب میں مسرت، مشکلات میں راحت، موت میں حیات کے سامان خوابیدہ! فتح و ظفرمندی پاؤں چومتی، سعادت و کامرانی رکاب تھامتی۔ اللہ کی نصرت کے فرشتے جلو میں، منزل کی تابناکی شمعِ راہ، دل، یقین کی دولت سے معمور، قدم، لذّتِ جادہ پیمائی سے محوِ خرام۔ غرضیکہ تمام عمر دریا کی طرح ایک مسلسل روانی، غیر منقطع جدّ و جہد یعنی ایمان و عمل کی زندہ تفسیر۔ یہ تھی مسلمانوں کے دورِ عروج کی ابتداء۔ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ سارا فلسفہ ایک جملہ میں مرکوز۔ یہ سپاہیانہ دور، سَابِقُوْنَ بِالْخَيْرَاتِ (۳۵/۳۲) کا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ

یعنی حسنِ عمل میں آگے بڑھنے کا دور۔ اس کے بعد ایک درمیانی دَور (مقتصدین کا) آیا۔ جو کچھ بزرگوں سے ترکہ میں ملا، اُس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ مجاہدانہ اعمالِ حیات کی طوفان انگیزیاں، درباری تکلفات کی بزم خیزیوں میں بدل گئیں۔ دینِ خداوندی کو تمام انسانی ضوابطِ زندگی (ادیانِ عالم) پر عملاً غالب دیکھنے کی بجائے، نظری مباحث اور منطقیانہ دلائل سے اس کی فوقیت و برتری ثابت کرنے ہی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا۔ قوانینِ خداوندی، جن کی تفسیر اعمالِ زندگی سے ہوتی تھی،

حروف ونقوش کے پیکروں میں سجا کر رکھ دیئے گئے۔ رفتہ رفتہ قوائے عملیہ مفلوج ہو گئے۔ ہمتیں پست ہو گئیں، ولولے سرد پڑ گئے۔ بایں ہمہ، اس دور میں بھی کہیں کہیں برسے ہوئے بادلوں میں بجلی کی چمک، اور جلے ہوئے نیستاں میں نیم تبسم شرار نظر آتا رہا۔ اس کے بعد تیسرا دور (ظالمین کا) آیا۔ دورِ عمل پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ باقی رہا ایمان، سو اس کے متعلق انھیں اسلاف سے کتابوں کے ذخائر ملے، جو نظری مسائل کے پیچ در پیچ مباحث سے بھری پڑی تھیں، اور یہ مسائل بھی یونان کے فلسفے اور عجم کے تصوّرات سے مستعار لئے گئے تھے۔ اب ان کے نزدیک ایمان، چند الفاظ کو ایک خاص طریق سے دُہرا لینے کا نام رہ گیا۔ اور اعمال چند رسوم کی میکانکی انداز سے ادائیگی! حالانکہ ایمان سے مفہوم تھا اللہ تعالیٰ کے متعیّن فرمودہ نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل یقین اور اعمال سے مقصد اس نصب العین کے حصول کے لئے جدّ وجہد۔ لیکن اس آخری دور میں سارا دین سمٹ سمٹا کر چند الفاظ کی ادائیگی کا نام رہ گیا۔ اور چونکہ ضابطۂ خداوندی میں نجات وسعادت ایمان سے مشروط تھی، اس لئے سمجھ لیا گیا کہ جو شخص ایک خاص انداز سے چند خاص الفاظ کو دُہرا دے گا، اس کی کامرانیوں اور شادمانیوں کا اللہ ذمّہ دار ہو جائے گا، کیونکہ ایمان کے صدقہ میں سعادت ونصرت کا عطا ہونا فرمودۂ خداوندی ہے۔ اس کے بعد یہ بحثیں چھڑیں کہ کیا اعمال کے بغیر خالی ایمان سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اگر ایمان اور اعمال کا قرآنی مفہوم سامنے ہو تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ایمان، وہ جذبۂ صادقہ ہے جو اعمال کا محرّک ہوتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جس سے شجرِ حیات، شاخِ طوبیٰ کی طرح بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے۔ اس لئے جس بیج سے درخت پیدا نہیں ہوتا وہ بیج ناقص ہے۔

مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

ایمان وعمل

قرآن کی رُو سے جس طرح وہ اعمالِ زندگی جن کی بنیادیں ایمان پر نہیں ہوتیں، ایسی بجلیاں بن جاتے ہیں جو انسانیت کے امن وسلامتی کے خرمنوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں، اس طرح وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمالِ حیات نہ کریں، برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے اس لئے فلاح وسعادت اس قسم کے ایمان سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ آج بدبختی سے مسلمانوں میں ایک طرف ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اصل مقصد "عمل" ہے۔ ایمان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال ایسی کھلی ہوئی گمراہی پر مبنی ہے کہ اس کی تغلیط اور تکذیب کے لئے کسی زیادہ

کاوش کی ضرورت نہیں. لیکن دوسری طرف صدیوں سے یہ عقیدہ عام مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے کہ تنہا ایمان (یعنی چند الفاظ کا دہرا دینا) نجات کے لئے کافی ہے۔ ان کے نزدیک من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جس نے ان الفاظ کو زبان سے دہرا دیا جنت کا وارث بن گیا. قریب قریب تمام مسلمان کچھ اسی قسم کی خوش فہمی میں مگن ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس غلط عقیدہ نے انہیں کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے. آج مسلمانوں پر جس قدر غربت و افلاس طاری ہے' یہ قوم محتاجی و بے کسی' ذلت اور رسوائیوں کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی ہے' نکبت و افلاس کی ہولناک گھٹائیں ان پر چھائی جا رہی ہیں. ہلاکت و بربادی کے جو بے پناہ سیلاب ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں. ذلت و مسکنت کی جو شرر بار بجلیاں ان کے خرمنِ حمیت و غیرت اور عزت و ناموس کو جلائے جا رہی ہیں' اگر بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو ان کا ذمہ دار یہی غلط عقیدہ ہے جو اُن کی جڑوں کو گھن کی طرح کھوکھلا کر گیا ہے اور جس نے انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا. بنی اسرائیل کی طرح ان کا بھی ایمان ہے کہ ہم خدا کے چہیتے بیٹے ہیں. یہ بھی اُن کی طرح یہی سمجھتے ہیں کہ ہم بہرحال جنت میں جائیں گے خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں. اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ قوم بھی خدا کی اس مغضوب و معتوب قوم کی طرح ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے عذابِ الیم میں گرفتار ہے' لیکن نہیں سمجھتی. عاد و ثمود کی طرح بتدریج

مُسلمان کی حالت

تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے' لیکن نہیں محسوس کرتی. قومِ لوط اور اصحابِ ایکہ کی طرح ان کی شوکت و عظمت کے تختے اُلٹ چکے ہیں' ان کی تہذیب و تمدن کی فلک بوس عمارتیں کھنڈرات بن چکی ہیں' جو ہر صاحبِ بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتے ہیں. لیکن یہ فریب خوردہ قوم دل رکھتی ہے اور اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتی. آنکھیں رکھتی ہے اور دیکھتی نہیں. کان رکھتی ہے مگر سنتی نہیں. اسے زمانہ کے تھپیڑے جھنجوڑتے ہیں. لیکن انہیں خواب آور لوریاں سمجھ کر اور گہری نیند میں چلی جا رہی ہے. دنیا علم و عمل میں ترقی کرتے کرتے آسمانوں کو چھو آنے کی ٹھانے بیٹھی ہے[1]. لیکن یہ اول تو اُن کی طرف دیکھتے ہی نہیں. اور اگر کبھی کبھار چشمِ نیم باز سے دیکھتے ہیں تو ایک حقارت آمیز تبسم سے اتنا کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں! اس چند روزہ متاعِ حیات سے فائدہ اٹھا لو' اس کے بعد دنیا میں بھی ہمیں غالب رہنے والے ہیں اور آخرت تو بالکل ہے ہی ہماری.

---

[1] اب تو وہ سچ مچ "آسمانوں" کو چھو آئے ہیں۔

پھر قیامت یہ ہے کہ یہ عقیدہ جہلا تک ہی محدود نہیں، بلکہ ان کے واعظ اور عالم، روز بروز اس عقیدہ کو پختہ تر کرتے چلے جارہے ہیں. حتیٰ کہ ایک جیّد "مولوی" صاحب اکثر وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو! کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو. خوب کرو. جی بھر کر کرو. لیکن ایک درُود شریف اوّل اور ایک درُود شریف آخر پڑھ لو مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ. اللہ کی رحمت کے یہ دو سمندر موجیں مارتے ہوئے ان کو بہا کر لے جائیں گے. حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد جیسا شخص، اپنی تفسیر میں یہ وضعی حدیث نقل کرتا ہے کہ

والذی نفسی بیدہٖ لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

(رسول اللہؐ نے فرمایا) اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہوجاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو، تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے، اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کردے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے.

(ترجمان القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۱۰۹، مطبوعہ زمزم کمپنی)

یہ اس قوم کے احبار و رہبان کے مواعظِ حسنہ ہیں، جن کے خدا کا فیصلہ ہے کہ

مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۝ (۹۹/۸)

جو شخص رائی کے ذرّے کے برابر نیکی کرے گا، وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی. اور جو رائی کے ذرّے کے برابر بُرائی کرے گا، وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی.

ایمانِ بلاعمل

قرآن کریم کے کسی صفحہ پر نگاہ ڈالئے، نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے جہاں اٰمَنُوْا آیا ہے، اس کے ساتھ ہی عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی موجود ہے. پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر صرف دوسرے ٹکڑے کو ماننے والے یُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَیَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (قرآن کریم کے ایک حصہ پر ایمان لانے اور دوسرے پر ایمان نہ لانے) کے جرم کے مرتکب قرار دیئے جاتے ہیں تو دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر صرف پہلے ٹکڑے پر ایمان لانے والے اس جرم سے کس طرح بچ سکتے ہیں؛ حالانکہ قرآن کریم کا صاف صاف فیصلہ موجود ہے.

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝
(۲۹/۲)

کیا لوگ یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان پر کوئی آزمائش نہیں ڈالی جائے گی۔

دوسری جگہ ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (۳/۱۴۱)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ ابھی تک اس بات کو ابھار کر سامنے نہیں لایا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور ثابت قدم ہے۔

کیا آپ نے سورۂ توبہ میں نہیں دیکھا کہ جب منافق اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کرتے تھے تو اُن کے ایمان کی شناخت کے لئے کونسا معیار مقرر کیا گیا تھا؟ یہی کہ

قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۹/۱۰۵)

اُن سے کہہ دو کہ ہاں کچھ کر کے دکھاؤ تاکہ تمہارے اعمال کو خدا اس کا رسول اور مؤمنین دیکھیں۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جب خدا کا عذاب سامنے آجائے گا تو اس وقت نہ تو اس شخص کو نفع پہنچے گا جو عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور نہ ہی اُس شخص کو جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل نہ کیا ہو گا۔ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (۶/۱۵۹) سمجھ نہیں آتا کہ ان سے زیادہ اور کون سے واضح الفاظ ہو سکتے ہیں، جن میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا؟ یاد رکھئے جس ایمان کے ساتھ اعمال شامل نہ ہوں گے وہ ایمان کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے محبوب ہیں، اس واسطے کہ ہم ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جس کے تم محبوب بنتے ہو، وہ تو اعلانیہ کہہ رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ ایک مسلم کا اس کے اعمال کی وجہ سے "دوست" ہے نہ کہ اس کے زبانی دعووں کی بنا پر۔

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶/۱۲۸)

اللہ ان کا دوست ہے، بوجہ ان کے اعمال کے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بُرے اعمال کی سزائیں تجویز کی ہیں وہاں مسلم اور غیر مسلم مؤمن و کافر میں کوئی تمیز، کوئی تفریق نہیں کی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا

تجزیہ ۲ (۴/۱۲۳)

نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا نہ اہلِ کتاب کی۔ جو بھی بُرا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔

کسے باشد، جو بھی بُرائی کرے گا اُس کے جُرم اُسے گھیر لیں گے، وہ جہنّم میں جائے گا اور وہیں رہے گا (۲/۸۱)۔ مثلاً حکم دیا جاتا ہے کہ ایمان والو سود نہ کھانا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا تاکہ تم تقویٰ شعار بن سکو۔ لیکن اگر تم اس حکم کی خلاف ورزی کروگے تو اُس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ

اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کے ٹکڑے پر نگاہ ڈالئے۔ خطاب یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان سود خوار ایمان کا مدعی ہے، لیکن جب اُسے اُس کے جُرم کی سزا میں جہنّم رسید کیا جاتا ہے تو وہ جہنّم کوئی الگ نہیں، وہی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے۔ فرمایئے اس شخص کے دعوئ ایمان نے اس میں کیا امتیاز پیدا کر دیا؟ اس سے بھی آگے بڑھئے! بدر کا میدان ہے۔ مسلمانوں کی کُل کائنات تین سو تیرہ نفوس، کچھ مہاجرین، کچھ انصار۔ گھربار، بیوی بچے، عزیز و اقارب، مال و دولت، سب کچھ چھوڑ کر ہتھیلیوں پر سر لئے خدا کے راستے میں جان جیسی گراں بہا چیز قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ وہ ایمان والے ہیں جنہیں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہا گیا ہے۔ وہ ہیں جن کے متعلق رسولِ خدا نے ابھی ابھی دُعا میں فرمایا ہے کہ اے اللہ یہ مٹھی بھر جماعت، تیری نام لیوا، تیرے نام کی حفاظت کے لئے، جانیں قربان کرنے کے لئے، میدان میں آئی ہے۔ اگر یہ مٹ گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ فرمایئے! ان کے ایمان میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ لیکن اسی مقام پر ان کا خدا ان سے کہتا ہے کہ یاد رکھو جو آج کے دن میدانِ جنگ سے مُنہ موڑے گا، سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت سے ملنے کی خاطر پہلو بدلے، تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنّم ہو گا، اور یہ بُری جگہ ہے رہنے کی (۸/۱۶)۔

بدر کا میدان

زبانی اقرار پر جنّت میں جانے کے متمنّی ذرا آنکھیں کھول کر اس ارشادِ مقدّسہ کو دیکھیں! جہاد تو عمل کی آخری منزل ہے۔ جو لوگ ایمان لائے تھے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی، ان کے متعلق سُنئے کہ فیصلہ کیا ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے۔ لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ تو جب تک یہ لوگ ہجرت نہ کر آئیں

ان کے ساتھ (مسلمانوں کا) دوستانہ تعلق نہیں ہوگا۔ (۸/۷۲)

دیکھئے ان لوگوں کے ایمان کی شہادت تو خود خدا دے رہا ہے کیونکہ انہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر پکارا ہے لیکن یہ صرف ایمان کے دعویدار ہیں۔ اصلی مومن سچے ایمان دار، مُؤْمِنُوْنَ حَقًّا تو صرف وہ ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ

(۸/۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہ لوگ اصل مومن ہیں۔ اُن ہی کے لئے مغفرت اور اُن ہی کے لئے عزت کا رزق ہے۔

ان کے برعکس۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۧ (۹/۸۸-۸۹)

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اور جہاد کیا اپنے اموال اور جانوں سے یہی لوگ ہیں جن کے لئے (سب) خوبیاں ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ ان کے لئے اللہ نے ایسی جنات تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

دیکھئے (سب خوبیاں، کامیابی وکامرانی کی تمام نعمتیں، دنیا کی سُرخروئی اور عاقبت کے انعام، سب انہی کے لئے ہیں جو ایمان کے ساتھ عمل میں پورے اُترتے ہیں۔

یہی نہیں کہ آخرت کی فلاح وبہبود ہی عمل کے ساتھ متعلق ہو، اس دنیا کی عزت ووقار کی زندگی، خوشحالی وخوش بختی کی زندگی، سرفرازی وسربلندی کی زندگی یعنی وہ زندگی جو فی الحقیقت ایک مومن کی زندگی ہونی چاہیئے۔ وہ بھی عمل کے ساتھ ساتھ مشروط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکومت اس لئے دی تھی

کہ ان کے کام دیکھے نہ زبانی دعوے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ہ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے تمہیں دنیا میں حکومت دی پہلی قوموں کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو

اگر تم عمل کی دنیا میں پورے نہیں اُترو گے تو تمہارے ایمان کے الفاظ کوئی قیمت نہیں رکھیں گے۔ وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (۹/۳۹) اس لئے کہ جہاں اس کا ارشاد ہے کہ:۔

وَ نُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہ (۷/۴۳)

ان سے پکار کر کہہ دیا جائے کہ یہ جنت ہے جس کے تم اعمال کے باعث وارث قرار دیئے جاتے ہو۔

وہیں اس دنیا کی جنت کے متعلق بھی اس کا فیصلہ ہے کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا کہ جو تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں تو اللہ ان کو زمین کی بادشاہت عطا فرمائے گا۔

پس اگر تم چاہتے ہو کہ اس دنیا میں تمہاری ہستی قائم رہے تو ایمانِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم بھی پیدا کرو کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اُن کے ایمان میں ذرا جنبش نہ ہوئی اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے اموال ونفوس سے جہاد کیا، یہی لوگ سچے ہیں۔

ورنہ یاد رکھو کہ خدا کے فیصلے، فطرت کی تعزیریں اٹل ہیں، غیر جانبدار ہیں۔ ہر چیز کی بقا عمل سے ہے۔ انسان کا تمام تر سرمایہ عمل ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے، نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں اور ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وہ قول وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار، وہ اصطلاحی ایمان جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی جس کی تصدیق آپ کے قلوب اور جوارح نہیں کرتے، قرآن کی میزان میں ایک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا، نہیں بلکہ ایسا زبانی دعوے ایک جرمِ عظیم ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کر کے نہ دکھاؤ۔

اور اگر خدا کے ان کھُلے کھلے فیصلوں کے بعد بھی آپ اس زعمِ باطل میں رہیں کہ چونکہ آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں، صبح سویرے مُنہ پر ہاتھ پھیرتے وقت زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی نکل جاتا ہے اس لئے آپ ضرور جنت کے وارث بن جائیں گے اور ساری دنیا پر غلبہ آپ ہی کا ہو جائے گا۔ اور محض اس لئے ہو جائے گا کہ آپ مسلمان کہلاتے ہیں۔ تو یاد رکھئے، یہ سراسر دھوکا ہے فریب ہے۔ اور فریب خدا کے ساتھ نہیں، دوسروں کے ساتھ نہیں، بلکہ خود اپنے ساتھ ہے۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔ یاد رکھئے! آج دنیا میں جہدِ للبقا (زندہ رہنے کی کشمکش) بڑی سخت ہو گئی ہے۔ قوموں میں باہمی منافست ہے، مقابلہ کی دوڑ ہے۔ جو قوم، جو ملک، جو شخص اس دوڑ میں، پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے ٹھہر گیا، ہلاک ہو گیا۔ پیچھے سے آنے والی قومیں اُسے بے رحمی سے کچلتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے قَاعِدِيْنَ (بیٹھنے والے) اور مُجَاهِدِيْنَ (دوڑنے والے) کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ قانون آپ پر نافذ نہیں ہوگا۔ کیا اربابِ قضا و قدر آپ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ آپ خاص قسم کے نام رکھتے ہیں، یا یہ عقیدہ دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ ہمارا زبانی اقرار ہماری کامیابیوں کے لئے کافی ہے؟ یاد رکھئے! فطرت کسی کی سوتیلی ماں نہیں۔ اگر اس نے پہلی قوموں کو تباہ کر دیا تو اس لئے کہ ان میں قوتِ عمل مفقود ہو چکی تھی، نہ اس لئے کہ ان سے اُسے کوئی ضد تھی۔ اور اب اگر آپ بھی وہی کچھ کریں گے جو ان قوموں نے کیا تھا تو وہ آپ کو اس لئے نہیں بخش دے گی کہ آپ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا خدا کے قانون کے متعلق بڑا غلط اندازہ لگانا ہے۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔

اسلام اور سائنس

(۱۹۳۵ء میں شملہ کے ایک جلسہ کی تقریر)

برادرانِ عزیز!

جیسا کہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہوگا، مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں عرض کرنا ہے اس کا عنوان ہے "اسلام اور سائنس"۔ سائنس سے یہاں مراد علمِ کیمیا اور طبیعیات (CHEMISTRY AND PHYSICS) ہی نہیں جن کی طرف اس لفظ کے اطلاق سے بالعموم ذہن منتقل ہو جاتا ہے، بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے اُن تمام علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہداتِ حسّی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادیات سے متعلق ہوں یا نباتات سے، عام حیوانات سے ان کا علاقہ ہو یا خود نفسِ انسانی سے۔ وہ اس کرۂ ارض کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا "کارِ زمین را نکو ساختہ" اجرامِ فلکی کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ یہ علوم اور ان علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام اور علمِ دنیوی کے عنوان پر عام طور پر جو کہا یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درخشندہ عہدِ ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لا کر یہ نظر فریب اطمینان دلا دیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیلِ علوم و فنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مردرہ چکے ہو۔ یہ داستان سنا دی جائے اور اس کے خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا، جو عام طور پر پیش کی جاتی ہیں اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہوں گے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں، لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں۔ اور میرے نتائج مستخرجہ افسونِ خواب آور ہونے کی بجائے اہلِ بصیرت کے لئے عبرت۔۔۔ د

موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالیئے وہ تغیر و تبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولان گاہ نظر آئے گی۔ مثلاً سائنس کی تحقیقات اور اثری انکشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب عمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے، اور ہمالیہ کی یخ بستہ چوٹیاں بحرِ اطلانطک کی سی گہرائیاں تھیں۔ آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری و ساری ہے

داخلی تغیّرات

لیکن ان انقلاباتِ ارضی و سماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا جیسا کہ ان تغیّرات کا جو زمین کی بجائے خود اہلِ زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطحِ ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب و تمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراجِ کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثارِ قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہو جاتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دورِ ہبوط میں سے گزرنے والی قوم اپنی دولت و ثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی، بلکہ اس کی ذہنیت بھی ایسی پستی کے گڑھے میں گر جاتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز مذموم نظر آتی ہے اور رو بہ ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب۔ وہ سعادت و نجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوشِ قدم میں۔ اور اسے فلاح و بہبود کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں۔ غرضیکہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے، سنتی ہے انہی کے کانوں سے اور سمجھتی ہے تو انہی کے دلوں سے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ:۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (۷/۱۷۹)

ان کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں، آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ ڈھور ڈنگر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج امتِ مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا میرا مقصود ہے۔

حضرات! زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ۔ زمانہ سے مراد آج اقوامِ یورپ ہی ہیں۔

جو ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سُرعت کے ساتھ اُڑتی چلی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی اِس محیّر العقول ترقی کا پس ماندہ اقوام پر جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے۔ لیکن اس کا مسلمانوں کی ذہنیت پر خاص طور پر بڑا ہلاکت آفریں اثر پڑا ہے اور اگر اس زہر کو جو ملّتِ اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت کرتا چلا جارہا ہے، جلدی زائل نہ کیا گیا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی ہستی کے جوہرِ خاص ہی کو کھو بیٹھیں۔ یورپ

اہلِ مغرب اور سائنس

کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا روڑا تھا۔ مسیحیت نے علمی ترقی کی کس قدر مخالفت کی ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھیئے معلوم ہو جائے گا جس درندگی کا سلوک جناب مسیحؑ کی معصوم بھیڑوں نے ہر جویائے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ اپنے تھے) کیا ہے، قتل و خونریزی کی بڑی سے بڑی خونچکاں داستانیں بھی اس کے سامنے شرمندہ ہیں۔ گلیلیو (GALILEO) کا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے اور اس نے دُوربین کے ذریعے کوپرنیکس (COPERNICUS) کے نظریہ کی تائید کر دی۔ رومن کلیسا اس کے خلاف جوشِ غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا۔ اس مقام پر یہ بتا دینا بھی خلافِ محل نہ ہو گا کہ مسیحیت، کوپرنیکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں تھی؟ یونان میں فلکیات کے متعلق ارسطو کا نظریہ نہایت قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا، اس نظریہ کی رُو سے زمین اس کائنات کا مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرامِ سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ فیثا غورث وغیرہ نے اس نظریہ کی اسی زمانہ میں تردید کر دی تھی لیکن بایں ہمہ اسے خاص اہمیت حاصل رہی۔ اور نظام بطلیموسی نظامِ فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسیحیت کے عقیدے کی رُو سے جملہ کائنات میں زمین کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی جس پر خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رُو سے زمین کو عالمِ موجودات میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی اس لئے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا۔

ازاں بعد، جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرامِ فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کائنات میں کوئی امتیازی شان حاصل نہیں، تو اس سے مسیحیت کے بنیادی عقیدے پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے کلیسا نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظامِ فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ چونکہ گلیلیو نے علیٰ وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لئے اربابِ کلیسا اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ اندھیر صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ، پراٹسٹنٹ نے بھی

اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے۔ اس پر خود لوتھر (LUTHER) پولاک اور میلانخفون (MELANCHTHON) وغیرہ کی تصنیفات شاہد ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑتا نہ تو اور کیا کرتا؟

ہندوستان میں اِدھر، ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہرِ فطرت جن سے کردوں کام لیتے تھے، دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر، اگنی اور دایو (پانی، آگ اور ہوا) جنہیں تابع فرمان بنا کر یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر رکھا تھا، ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت بجالانا پڑتا تھا۔ جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا اور اس طرح قدیم مذہب تیاگ دیا گیا۔

مسلمان بھی مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انہوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی کہنا شروع کر دیا کہ صاحب ہو نہ ہو، ہمارے موجودہ نکبت و افلاس، ہبوط و تنزل، پس روی و تہی ماندگی کا ذمہ دار اسلام ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے ان کے سامنے اسلام کا غلط مفہوم پیش کیا، لیکن اسلام ایسا دین نہیں جس کی حقیقی تعلیم کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ ایسے لوگوں کو چاہیئے تھا کہ یکطرفہ ڈگری صادر کر دینے سے پہلے اسلام کو موقعہ دیتے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرتا۔ وہ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھتے اور پھر اس باب میں اپنی رائے قائم کرتے اور اس کے بعد اس کا اظہار بھی کرتے۔ اگر وہ اتنی تکلیف گوارا کر لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ دنیا کی اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لئے کہ ان کا مذہب، ان کی علمی ترقیوں کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے مسلمانوں کا حقیقی دین، علم و بصیرت کا سب سے بڑا حامی ہے اور ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں ہنوز دین کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی تھے۔ دوسروں کو اگر ترقی کرنے کے لئے مذہب چھوڑنا پڑتا ہے، تو ان کے برعکس مسلمان ترقی کر ہی نہیں سکیں گے، جب تک کہ حقیقی دین کو اپنا راہبر و ہادی نہیں بنائیں گے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے نہ تو خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی صنمیاتِ یونان کے افسانے۔ بلکہ یہ قرآنِ کریم کی واضح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں۔ جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے باب میں اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب مسلمانوں نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے۔ تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادت

پر مبنی ہوگا تاکہ اس میں جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

قرآن اور علمُ الفطرت

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنایا اور اسے اس قدر شرف بخشا ہے وہ امتیازی خصوصیت کون سی ہے؟

قرآنِ کریم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف وحسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالٰی نے ملائکہ سے کہا کہ اب میں دنیا میں ایک نئی مخلوق کو متمکّن کرنے والا ہوں۔ جب فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے اس پیکر کو دیکھا تو اس کے آب و گِل میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں بھی نظر آئیں۔ عرض کیا کہ بارِ الٰہا! کیا دنیا اب اس کے سپرد کی جائے گی جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل و خوں ریزی کا مرتکب ہوگا؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالٰی نے جواب دیا کہ ہم بہتر جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقعہ پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکرِ خاکی خلافتِ ارضی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا۔ اللہ تعالٰی نے انسان کے اندر حقائقِ اشیاء کا علم حاصل کرنے کی صلاحیّت رکھ دی اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے مسجودِ ملائک قرار دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ شرف و مجد جس کی بنا پر انسان کو سابقہ آبادیوں کا جانشین بنایا گیا تھا[1] وہی علم الاشیاء ہے جس کے ایک حصّہ کو یورپ علم الفطرت (NATURAL SCIENCE) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے علم کی فضیلت کے متعلق کہا کہ:

علم اور قرآن

قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۳۹/۹)

کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ تحصیلِ علم کی تحریک و تحریص کے لئے نبیِ اکرمؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں۔ مثلاً حضورؐ نے فرمایا کہ "جو شخص طلبِ علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں۔"

کتاب و سنّت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اس تعلیم پر کاربند ہوئے۔ اگرچہ مسلمانوں میں علمی ترقیوں کی طرف رجحان "بنی اُمیّہ" کے وقت ہی سے شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اُندلس کی اُموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ اور بغداد

---

[1] واضح رہے کہ ان علوم کا تعلق طبیعی کائنات سے تھا۔ دین سے نہیں تھا۔ دین اس زمانہ میں اپنی اصل سے ہٹتا جا رہا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام خطوط"۔

وہ مرکز تھے جہاں سے آفتابِ علم وفضل اقصائے عالم میں ضیا پاشی کرتا تھا. اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لئے بہت بڑی فرصت درکار ہے. اس لئے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم وفنون کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا. یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اس زمانہ کی مجموعی ہیئت سے کرنا چاہیئے. علومِ فطرت میں دنیا آج من حیث الکل بہت آگے بڑھ چکی ہے. میں جس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں اُس وقت یورپ کا بیشتر حصہ پتوں اور کھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا.

علم الارض

سب سے پہلے علم الارض کو لیجئے.

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا. خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی. محمدؐ ابن موسیٰ اس (SURVEY PARTY) کے انچارج تھے. نیز اس نے (ستر) علماء (SCHOLARS) کی مدد سے کرۂ ارض کا ایک نقشہ بنوایا. ان میں الخوارزمی بھی تھے جنہوں نے اپنی کتاب میں تمام رُوئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے. اس سے قبل بطلیموسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا.

(۲) مسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (GLOBE TROTTER) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پاپیادہ کیا اور اپنے مشاہدات قلمبند کرتا چلا گیا.

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابوبکر نے تمام رُوئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں.

(۴) ادریسی بھی اسی زمانہ کا مشہور جغرافیہ دان ہے. جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صقلیہ (سِسلی) کے عیسائی بادشاہ (راجر زدوئم) نے اسے اپنے دربار میں بلالیا. اُس نے وہاں بادشاہ کے لئے ایک چاندی کا کرہ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا.

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو، ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے. جن کی علمی کاوشیں آج تک اہلِ علم وتحقیق کے لئے مایہ ناز ہیں.

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے. پہلا حصہ اپنے مشاہدات پر، دوسرا ثقہ روایات پر اور تیسرا مطالعہ پر مبنی ہے.

(۷) الخوارزمی نے اُس زمانہ میں جب کہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپ میں نظریہ (ARIM) کہتے ہیں. اس کی رُو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا. بیکن نے اس نظریہ

سے استفادہ کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

جہاز رانی

۲۔ جغرافیہ کے ساتھ ہی جہاز رانی منسلک ہے۔

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کانٹن تک جا پہنچے تھے اور وہیں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر ان ہی تجار کی بدولت پھیلا، کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکوڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا تاکہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگایا' وہ ایک عرب جہاز راں' احمد ابنِ مجید تھا۔

(۳) نہر سویز کھودنے کا خیال حضرت عمروؓ ابن العاص (عہدِ فاروقی) کے حجلۂ دماغ کا رہینِ منت ہے۔

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجار جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خفیف سا اندازہ اس سے لگائیے کہ عربوں کی تجارتی اور جنسی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں۔ مثلاً (TRAFFIC) وہی لفظ ہے جو عربوں کے ہاں طریق (یعنی راستہ) تھا۔ (TARIFF) اُن کے رسم الطریف سے نکلا ہے۔ (MAGAZINE) عربوں کا مخزن (بمعنی اسٹور) ہے۔ (CHEQUE) جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے' صلث کا تفرنج ہے۔ اسی طرح (COTTON) اُن کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ (ORANGE) وہاں کا نارنج۔ (LEMON) لیموں۔ اور (SAFFARON) ان کے یہاں زعفران ہے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ چنانچہ مشہور عیسائی جغرافیہ داں مسٹر سلطرون لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحرِ اطلانطک میں مختلف مقامات اور زمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

تاریخ

(۳) زمین کے بعد اہلِ زمین کے حالات' یعنی علمِ تاریخ کو دیکھئے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں[۱] ہے۔ ابنِ خلدون کا مقدمہ تاریخ' فنِ تاریخ میں' جسے (FROUDE) نے تاریخ کی سائنس کہا ہے' آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اور اسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہدِ عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں۔ مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے

---

[۱] اس وقت اس سے بحث نہیں کہ دینی نقطۂ نگاہ سے اس تاریخ کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے لئے دیکھئے "ہماری تاریخ" (سلیم کے نام خطوط۔ جلد سوم)۔

جس طرح مقدسی نے جغرافیہ کا لکھا تھا۔

فلسفہ

(۴) اب فلسفہ اور لٹریچر کو لیجئے جو ایک مہذب قوم کے نظامت حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلام مشہور مستشرق، لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت ہوئی مسلمانوں کے تراجم کی رہینِ منت ہے۔ فارابی، ابنِ سینا، ابنِ ارشد وغیرہ حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے آگے کھول کے رکھ دیں۔ حتیٰ کہ لاطینی زبان میں بھی، جو یورپ کے جملہ علوم و فنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے، جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستے سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو (ALFANSO THE WISE) نے مشہور فلاسفر ابوبکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفہ کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گِب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندۂ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور رومان کے مسئلہ میں عربوں کا زیرِ بارِ کرم ہے۔ قریب قریب یہی الفاظ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں مسٹر ہائینڈ نے لکھے ہیں۔ (LEWES) ہسٹری آف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم (امام غزالی) کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوگیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

طبّ اور طبیعیات

(۵) اب طب اور طبیعیات کو لیجئے۔ سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافاتِ طبعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بہ تمام وکمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ صرف قسطنطنیہ کی قریب ششتر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کدوکاوش سے بہم پہنچائی گئیں اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں، اس کا اندازہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور سائنس دان، حنین بن اسحٰق، کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لئے عراق، شام، فلسطین اور مصر کا پیادہ سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لئے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علمِ طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۲۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں جن میں اکثر جرِ ثقیل، مدّ و جزر، روشنی، آب و ہوا، فلکیات، معدنیات اور نباتات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی، ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخلِ نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت

حاصل کر چکا ہے۔

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تیس برس کے عرصہ میں صرف ایک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق، جمادیات کی تحقیق، زلزلوں کے اسباب، اصولِ آلات، ٹمپریچر (مقیاس الحرارت) اور دیگر عناصر طبیعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں۔

اخوان الصفا نے، جو دسویں صدی میں ایک خفیہ انجمن تحقیقاتِ علمی کے لئے قائم ہوئی تھی، سائنس کا انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے جو ۵۲ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے، ۱۷ مقالات علم الفطرت (NATURALE SCIENCE) سے متعلق ہیں۔

ابن خطیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کئے اور تعدیہ کے لئے حفظِ ماتقدم کے اصول متعین کئے۔

ابن زہر اندلسی کی کتاب التاثیر، خواص الادویہ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے۔ اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحت پر کتاب، علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے۔

میکانکس

عملی میکانکس کے متعلق حکیم جزری نے تیرہویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے عملی میکانکس کے آلات ایجاد کر کے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا۔ اسلامی ممالک میں کاغذ آٹھویں صدی میں رائج ہو چکا تھا۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال میں آتی تھیں۔ چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب و غریب گھڑی تحفۃً شاہ شارلمین کو بھیجی تھی۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ الکیمیا، (CHEMISTRY) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے آتشیں مرکب ایجاد کئے۔ تیزاب مثل، نائٹرک ایسڈ، ہائیڈرو کلورک ایسڈ، پوٹاس، ایمونیا، کلورائیڈ آف مرکری وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے۔ زہروں کو دوائیوں میں تبدیل کیا اور (GASSES) کی خصوصیات دریافت کیں۔ ملاحظہ ہو (INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE)

فلکیات

فلکیات کو دیکھئے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسیہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصدگاہ (OBSERVATORY) قائم ہو چکی تھی، جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ یحییٰ ابن منصور اس رصدگاہ کا انچارج تھا۔ اس کی کتاب الاعمال، علم ہیئت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یورپ ابھی کل تک بطلیموسی نظام کا قائل تھا جس کی رو سے زمین ساکن

بتائی جاتی تھی. لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوفیانہ توجیہات کی دھجیاں اڑائیں اور اس کی جگہ اس نظامِ فلکی کی بنا ڈالی جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے۔

علاوہ بریں مختلف علوم و فنون کے متعلق مسٹر ٹی ایل وسوانی ایم اے لکھتے ہیں کہ "یورپ جس زمانے میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکمائے اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آگے بڑھے اور یورپ کو طب، ریاضی، فلسفہ اور دیگر علوم میں درس دینے لگے۔ وہ لوگ جہازوں کی ساخت، باغوں کی پرورش پھولوں کے تحفظ، لوہے اور پیتل کے ظروف، روئی اور ریشم کے کپڑے، طباعت و مرصع کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

لیکن یہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات علمائے اسلام کی ذہنی افتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ نہ تھے

جذبۂ محرّکہ

بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سرانجام پاتے تھے۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو انہیں علمی کاوشوں پر آمادہ کر دیتی تھی. ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ، وہ قوتِ محرکہ ان کے دین کی تعلیم تھی. حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نظامِ حیات میں دین ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے. جب تک دماغ روبہ اصلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن و خوبی کام کرتے رہتے ہیں. لیکن جب اس سرچشمۂ قوت و اصلاح میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اگرچہ اعضاء و جوارح بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں. لیکن ان کی قوتِ عمل سلب ہو جاتی ہے. چونکہ اس زمانہ میں حرارتِ دینی نظامِ حیات میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھی اس لئے ہر شعبۂ زندگی اپنی اپنی جگہ نشوونما اور ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا. یہی دینی ولولہ تھا جس سے وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا. جب علمی ریسرچ کے لئے اس قدر آسانیاں موجود ہیں. آج کسی سکالر کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو، اس کی مدد کے لئے فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں تیار ہو جاتی ہیں. فنڈ جمع کئے جاتے ہیں. رفقائے کار سربکف پابہ رکاب ہوتے ہیں. اگر وہ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تو ہالینڈ کا مکھن، لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی غرض انہیں سب کچھ وہاں پہنچتا رہتا ہے. لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ ابنِ جریر لکھتے ہیں کہ جب تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے چادر میں باندھ دیئے تھے. معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ وضو کے پانی میں بھگو کر

کھالیتا۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہو گئے تو دار العلوم کا دروازہ چھوڑنا پڑا اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہیں ہوا تحصیلِ علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ ابنِ حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انہوں نے تحصیلِ علم کے لئے نو ہزار میل پیادہ سفر کیا۔ ضیاء الدین ابنِ عاصم نے نباتات کی تحقیق کے لئے روم، یونان اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی، نہ سونے کو چھت میسر آتی۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں، پنڈلیاں گرد و غبار سے اَٹ رہی ہیں، لباس چیتھڑے ہو رہا ہے، چہرے پر ضعف و نقاہت سے مُردنی چھا رہی ہے، لیکن سر میں ایک سودا ہے کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا اور ان کی یہ ہیئت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ ؎

بے دست و پا ئیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

تہذیبِ اخلاق و تزکیۂ نفس ہو، یا تدبیرِ مملکت و تنظیمِ جیوش، علوم و فنون کی تحقیق ہو یا تمدن و تہذیب کی کاوش، سب منزلیں اسی جوش کے جذبہ میں طے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک ؎

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

قرآنی تحریک

اس لئے کہ قرآن کریم گوناگوں طریقوں سے تدبر و تفکر کی تائید کر رہا ہے۔ کہیں حکم ہے، کہیں ترغیب و ترہیب۔ کہیں عدمِ تفکر پر مذمت۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری طرح محض ثواب کی غرض سے نہیں پڑھتے تھے بلکہ یہ ان کے نزدیک دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور اور ضابطہ تھا۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا:۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
(۴۷/۱۰)

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزر چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟

ہم اس آیتِ مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ دورِ عمل تھا جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ نے فرمایا:۔

"ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کی حقیقت سے آگاہ

نہ ہو جاتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا آگے نہ بڑھتا۔" (تفسیر ابن جریر)

انہوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا۔ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور مساحتِ ارضی سے علمِ جغرافیہ کی بنا پڑی۔ اقوامِ گذشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی جائے تو علمِ تاریخ مرتب ہو گیا۔ اور ان کے اُجڑے ہوئے کاشانوں کو چشمِ عبرت سے دیکھا تو آثارِ قدیمہ کا علم وجود میں آ گیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیتِ قرآنی پر تدبر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔ انہوں نے اس آیت کو دیکھا:۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (۱۶/۷۹)

کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو سما میں مسخر کیے گئے ہیں اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنبھالتا اس میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس پر غور کیا کہ اس میں ایمان والوں کے لیے جو نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ کیا ہیں؟ اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچتے۔ انہوں نے کوشش کی اور جرمِ ثقیل، مرکزِ ثقل، کششِ ارضی کے سے نظریئے دریافت کئے۔ یہی وہ نظریئے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔

انہوں نے رتق و فتق کی آیت پر غور کیا تو ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ آسمانوں کے تمام کرے آغازِ پیدائش میں ایک ہیولیٰ سے مرکب تھے۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کُرے بن گئے۔

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ○ (۲۱/۳۰)

کیا ان لوگوں نے جو آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے؟

آیت کے آخری ٹکڑے سے ان کی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیات اشیاء کا قوام اوّلین پانی سے ہوا۔ کیا رتق و فتق اور پانی کا مبداءِ حیات ہونا آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں؟ نظریہ ارتقا؟

(EVOLUTION THEORY) آج سائنس کی تحقیقات کا معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے. لیکن اہلِ علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اس کی ابتدا بھی مسلم ائمہ علم و حکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہینِ کرم ہے. فارابی، ابن سینا ابنِ مسکویہ اور ابنِ باجہ نے اپنی تصانیف میں اس نظریہ پر کافی روشنی ڈالی ہے. انہوں نے تکویرِ لیل و نہار اور تسخیرِ شمس و قمر کی آیات پر غور کیا تو ان پر فلکیات کے راز منکشف ہو گئے.

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ (۳۹/۵)

اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا وہ رات کی تاریکی پر دن کی روشنی اور دن کی روشنی پر رات کی تاریک چادر لپیٹ دیتا ہے اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک ایک وقتِ معین تک چلے جا رہا ہے.

انہوں نے جس نظامِ شمسی کی بنیاد قرآنِ کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی آخری سرحد ہے. چنانچہ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلیموسی نظام کی تغلیط کر کے فارابی کی رہنمائی، علم الافلاک کی صحیح منزل کی طرف کی. فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ یہ سورج معہ اپنے نظام کے ایک اور ستارہ کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے. اس ستارہ کو ویگو کہتے ہیں. لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا.

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۗ (۳۶/۳۸)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اس خدا کا جو زبردست علم والا ہے.

غرضیکہ ان اہلِ نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیتِ الٰہی، ایک خداوندی نشان، ایک رازِ فطرت مضمر ہوتا تھا. وہ ہر چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برافگندہ عروسِ حقیقت کو علمی تحقیقات اور علمی تجارب سے جنت نگاہ بنا لیتے. صبح کی سپیدی میں، رات کی سیاہی میں، شفق کی رنگینی میں، قوسِ قزح کی ندرت آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، بادلوں کی روانیوں میں، نسیم سحر کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، انہیں صحیفۂ فطرت کے اوراق کھلے ملتے جو انہیں

دعوتِ علم و عمل دیتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۲/۱۶۴﴾

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور رات دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا، پھر اس سے زمین کو پژمردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہواؤں کے (رُخ) بدلنے میں اور بادلوں میں، جو زمین و آسمان کے درمیان مقیّد (معلق) رہتے ہیں، سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

ایک مسلمان کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر محکم یقین رکھے، وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کر دے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے نزدیک مؤمن کی صفت ہی یہی ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کارگہِ ہستی پر غور کرے اور اس کی نگاہِ دقیقہ رس پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخِ گل کی ان گہرائیوں تک جا پہنچے جہاں ایک ہی قسم کے قوام سے پھول کو مشامِ جانفزا اور کانٹے کو نوکِ خلش زا عطا ہوتی ہے۔ وہ چل رہا ہو تو گل بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوتِ نظارہ دے۔ بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرہ میں ہزاروں آفتاب درخشاں نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی ایک جڑاؤ چھت مرصّع کار کی صنعت تحسین و تزئین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضیکہ نہ اس کا اُٹھنا بیکار ہو، نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت ؎

بیٹھے تو عجزِ نقشِ کفِ پا لئے ہوئے!
اُٹھے تو دردِ دل کا بہانہ لئے ہوئے!

اس لئے کہ اس کے خضرِ راہ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ
وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا

(۱۹۰ - ۳/۱۹۱)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور رات دن کے آنے جانے میں اہلِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں، وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کے قانون کو سامنے رکھتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے اس (موجودات) کو منفیانہ طریق پر پیدا نہیں کیا۔

ہم رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا کا دعوے اس وقت کر سکتے ہیں جب ہم فی الحقیقت دنیا کی ہر ایک چیز کو سود مند ثابت کر دکھائیں، اور یہ چیز "علمِ حقائقِ اشیاء" اور "علمِ منافعِ اشیاء" کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

توہم پرستی

برادران! سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر چیز کی کنہ و حقیقت کو آشکارا کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے؟ مذاہب کی دنیا میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و بُرہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے جنگ چلی آتی تھی لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعوے ہے کہ:۔

اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸)

(اے رسول کہہ دیجئے کہ) میں اور میرے متبعین جو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علیٰ وجہ البصیر دیتے ہیں۔

حضرات! اس دھندلے سے خاکے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے۔ مسلمانوں کے دورِ عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہنچ گئی تھیں۔ پھر یورپ کے محققین اور علمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے۔ یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے۔ ان کے ذاتی کیریکٹر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیریکٹر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقویٰ کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ علاوہ ازیں، اگر

انفرادیت کو چھوڑ کر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوامِ مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لیئے کہ ایک قوم کی قوتِ قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے۔ سائنس کی کرشمہ سازیاں میدانِ حرب میں اقوامِ مقابل کو بالادست نہ کر دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد سائنس کی ترقی کی رفتار اس قدر برق رفتار ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوامِ عالم میں باہمی اعتماد اُٹھ چکا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور اسی لئے سائنس کی ایجادات مین ایک دوسرے پر مسابقت کی فکر دامن گیر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک جذبہ یہ ہو اس سے اہلِ عالم کے امن و سکون اور اطمینانِ قلبی میں کس قدر اضافہ ہو گا؟ برعکس اس کے مسلمانوں کی ترقیوں کا مطمحِ نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر ان کا کیا اثر پڑا؟ اگر اس کے متعلق ہم خود کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا اس کے لیئے ایک غیر مسلم کی رائے سنئے۔ مسز سروجنی نیڈو کہتی ہیں:۔

"عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں؟ فتح و ظفر و دولت کے لیئے نہیں، ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا۔ اس کا مقصد حریت و آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لیئے مرتے ہیں اور علاقوں کا رونا روتے ہیں۔ لیکن اسلام کا مطمحِ نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا اور مسلم داعی یہی دھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ عربوں نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں، بلکہ دل اور دماغ فتح کیئے۔ انہوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے وہم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا۔ ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انہوں نے ڈالی۔ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق، فیاضی اور مردانگی ہمیشہ ان کی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعتِ علوم میں کبھی بخل نہیں رکھا۔ یہ ہمیشہ بنی نوعِ انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں۔"　　(وکیل مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء)

یہ اس لیئے تھا کہ انہوں نے علم کو دین کے تابع رکھا اور اس سے احکامِ خداوندی کے مطابق کام لیا۔

برادران! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند روشن خیال طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شئے

کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکمائے یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی پہ پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن کریم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریہ سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اُسے قرآنِ حکیم کی صداقت کا معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اس کا چرچا کرتے ہیں اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے کسی نظریہ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس امر میں صرف ہو جاتی ہے کہ قرآن کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان یا موڑ توڑ کر یورپ کے نظریہ کے مطابق ثابت کر دیا جائے وہ

سائنس اور قرآن

اس "جہادِ عظیم" کی دُھن میں قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر، خود اپنوں کو بھی ہنسی آجائے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصولِ قرآن فہمی کے متعلق بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات (خواہ کسی ملک میں ہوں یا کسی زمانہ میں) جب بھی یقینیات کے درجہ کو پہنچ جائیں گے، یہ ممکن نہیں کہ وہ ارشاداتِ قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لئے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ بنابریں کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ صحیفۂ فطرت کے مصنفِ حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے؟

این خیال است و محال است و جنوں

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریہ کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ہزاروں قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی ایک موجد کی زندگی ہی میں اس کا قیاس غلط ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اس کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہٰذا آج جو نظریہ قرآن کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ محکم اور یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں۔ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بیّن فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ آج تک قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔

یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جب بعض حکمائے اسلام نے قرآنِ حکیم کو فلسفۂ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا حالانکہ فلسفہ کے اصول قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس فلسفۂ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انہی لوگوں کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآن خیال

کرتے تھے ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہوگئیں۔ جو آیاتِ قرآنی کسی خاص زمانہ کے قیاسی نظریوں کے مطابق نہ ہوں ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ نظریئے ہنوز قیاس ہیں۔ جب زمانہ کی مزید علمی ترقیوں سے قیاس حقیقت میں بدل جائے گا تو وہ ان آیات کے عین مطابق ہوگا۔ یہی آج تک ہوتا چلا آیا ہے اور یہی اس کے بعد ہوگا۔

آخر میں ایک مختصر سی گزارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن چونکہ بات قرآن کی ہے اس لئے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآنِ کریم نے جس علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس کی تعریف کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں آیا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس بات کا نہیں علم نہ ہو اُس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان، آنکھ اور دل۔ ان سب سے باز پرس ہوگی۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک، علم وہ ہے جس کی شہادت سمع، بصر اور قلبِ سلیم دیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے، علم کے درجہ تک نہیں پہنچتا۔ ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصابِ تعلیم مقرر ہے غور فرمایئے کہ اس میں کتنا حصہ ظن و قیاس کا ہے اور کتنا علم و یقین کا۔

ہمارے مذہبی مکاتب

فلسفۂ یونان، منطق، علم الکلام (جسے فی الحقیقت فلسفۂ یونان ہی کی ایک شاخ کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں اور ایسے کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انہیں کوئی قبول نہیں کرتا۔ یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں اُلجھا رہا۔ مسئلہ پیش ہوتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہوسکتے ہیں یا نہیں"۔ ایک جماعت اثبات کی طرف اور دوسری نفی کی طرف ہوجاتی۔ دلائل پر دلائل دیئے جاتے۔ منطقی توجیہات پیش کی جاتیں۔ صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے۔ لیکن کوئی اتنا نہ کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں۔ حتیٰ کہ ان میں بیکن پیدا ہوا۔ اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرحہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی۔ اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ علم کی اس تعریف کے بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی۔ اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ ا۔

ہوئی لاکھ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویۂ نگاہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں بدلیں. حقیقت یہ ہے کہ "علمِ دین" سے مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اسے زندگی کے تمام مراحل میں شمعِ ہدایت بنا سکیں اور اس کی روشنی میں منزلِ مقصود تک پہنچیں. لیکن اگر ہم اس شمع کو اپنی کوٹھڑیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے نورانی ہونے میں شبہ نہ ہوگا لیکن ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے. وہاں وہی پہنچے گا جو مسافت قطع کر رہا ہوگا. علمِ دین' امورِ دنیاوی میں اسی صورت میں کام آسکتا ہے جب وہ اس قسم کا علم ہو جس کی تعریف قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے. اور یہی علم کا وہ حصہ ہے جسے علمِ فطرت کہا جاتا ہے. لہٰذا جب تک اس حصۂ علم کی تکمیل نہ ہو' اسلام کا کوئی عالم' عالم نہیں بن سکتا*. اسلام کے دورِ ترقی میں عالِم کے لفظ سے ذہن کسی زاہد گوشہ نشین کی طرف منتقل نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس وقت عالِم اور حکیم سے مراد وہی ہوتی تھی جو آج کل ریسرچ سکالر یا سائنٹسٹ سے ہوتی ہے. چنانچہ اگر نظامیہ میں ایک طرف امام غزالی دینیات کا درس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف علامہ بہاء الدین ریاضی اور تاریخ پر لیکچر دیتے تھے. خود مساجد میں اسی قسم کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے. مصر کے خلیفہ العزیز کے زمانہ میں جامع الازہر میں لٹریچر اور طبیعیات پر لیکچر دیئے جاتے تھے اور اسی نصابِ تعلیم کا اثر تھا جس نے وہ قوم پیدا کر دی جس کے علمی احسانات سے تمام مہذب دنیا کی گردن جھک رہی ہے اور جن کے علمی کارنامے سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب تمہارے تابع فرمان بنا دیا) کی زندہ تفسیر ہیں. یقین مانئے اگر ہم بھی اپنا نظریہ بدل لیں اور علم کی صحیح تعریف اپنے پیشِ نظر رکھیں تو یہ زمین بدل جائے گی' یہ آسمان بدل جائے گا' اور ایک دن ہم پھر یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ ؎

زمین از گردشِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

---

* علماء کسے کہتے ہیں' اس کے متعلق دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" (جلد سوم).

خُدا کی پادشاہت

(نوشتہ مئی ۱۹۳۹ء)

یوں تو دنیا میں ہر شکار میں ایک لُطف ہے لیکن انسان سب سے زیادہ لذّت اُس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ نوعِ انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی سلسلہ صید و صیّاد کی ایک مسلسل داستان ہے۔ تہذیب و تمدّن، معاشرت و عمرانیت کے بدلنے سے محض جال کی نوعیتیں بدلتی رہی ہیں، لیکن جذبہ ہمیشہ وہی کارفرما رہا ہے۔ اصطلاحات میں تغیّر و تبدّل ضرور ہوتا ہے لیکن مفہوم ہر جگہ وہی رہتا ہے۔

انسان اپنے عہدِ طفولیت میں انفرادیت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ایک ایسی "جنّت" میں رہتا تھا جہاں ؏

کسے را با کسے کارے نباشد

لیکن یہ زندگی بچپن کی زندگی تھی۔ اس کی معاشرت کسی اور اسلوبِ حیات کی متقاضی تھی۔ ارتقائی منازل میں انسان تمام مخلوق سے آگے تھا۔ اس کی تخلیق "فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (بہترین ہیئت پر) ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیگر مخلوق کے مقابلہ میں، جسے اُس نے اپنا تابع فرمان بنانا تھا، یہ بہت کمزور اور نہتّہ پیدا کیا گیا تھا۔ دوسری مخلوق پر تغلّب و تسلّط تو ایک طرف، اسے اپنی مدافعت اور حفاظت کے لئے بھی کوئی سامان نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے جذبہ تحفّظِ خویش کا تقاضا تھا کہ یہ اجتماعیت یا مدنیت کی زندگی بسر کرے۔ ایک جماعت بن کر رہے۔

اجتماعی زندگی (HERD INSTINCT)

اس لئے جب یہ بچپن کی زندگی سے ذرا آگے بڑھا تو اس کے احساسِ اجتماعیت میں بیداری پیدا ہوئی اور اس نے قبائلی زندگی اختیار کی۔ اس

طرزِ زندگی کا تقاضا تھا کہ آپس میں کام بانٹ لئے جائیں۔ مختلف لوگ مختلف ضروریاتِ زندگی اور داعیاتِ حیات کے ذمہ دار ہوں۔ یہ تقسیمِ عمل تھی جس سے انسانی "گروہ سازی" کی ابتدا ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس "سوسائٹی" میں فرائضِ مفوضہ یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ کچھ فرو تر تھے کچھ بالاتر۔ اگر ایک گروہ کے حصّہ میں قبیلہ کے لڑائی جھگڑے نپٹانے کا کام آیا ہوگا تو دوسرے کی ڈیوٹی ڈھور ڈنگر چرانے پر لگی ہوگی۔ جن لوگوں کے حصّے میں بالائی سطح کے کام آئے انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چوپاؤں کی سیاقت میں وہ ذہنی تعیّش کہاں جو خود اپنے جیسے انسانوں کی سیادت میں ہے۔ جانوروں کے شکار میں وہ لذت کہاں جو اپنے ہم جنسوں کے خون میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کرنا شروع کیں کہ ہاتھ آئی ہوئی طاقت کبھی چھننے نہ پائے۔ یہیں سے حکومت کی بنیاد

حکومت

پڑی۔ یعنی ایک انسان کا دوسرے انسان پر غلبہ و اختیار۔ اربابِ اقتدار نے اپنی سطوت و تغلّب کو قائم رکھنے کے لئے مختلف قوّتوں کو اپنے اندر مرکوز کرنا شروع کیا، تاکہ ان کے خوف اور دبدبے سے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنائے رکھیں۔ حصولِ قوّت اور اس کے استحکام و استبقار کے اسی اہتمام و انتظام کا نام نظامِ سلطنت قرار پایا، اور جس کے ہاتھ میں قوّت و اختیار ہو اس کی مرضی اور منشار کا نام قانون رکھا گیا۔ ابتدا تو ہوئی تھی اس ضرورت کے ماتحت کہ انسان اپنی حیاتِ اجتماعیہ کا نظامِ تقسیمِ عمل سے صحیح طور پر قائم کر سکے، لیکن یہی چیز اس کے جذبۂ اقتدار کی تسکین کا سامان بن کر رہ گئی۔

انسان کی ابتدائی زندگی قبائلی زندگی تھی۔ قبیلے کا بزرگ تمام جھگڑے چکانے اور مشترکہ امور کے سرانجام دینے کا ذمہ دار تھا۔ چونکہ یہ اختیارات ایک فرد کے ہاتھ میں تھے اس لئے اس سے دنیا میں شخصی حکومت کی بنار پڑی، جو ذاتی املاک اور جائیداد کی طرح اس کی اولاد میں متوارث آتی رہی۔ جب انسانوں نے اس طرزِ حکومت کے خلاف بغاوت کی تو بطورِ انتقام یہ اختیارات پھر فرد سے جماعت کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اسے جمہوری حکومت کہا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے خلاف بھی بغاوت شروع ہو گئی تو پھر وہی شخصی حکومت ڈکٹیٹر یا آمریت کی شکل میں رونما ہو گئی (شخصی حکومت تھی تو 'جمہوری حکومت کا انداز تھا تو' اور اس کے بعد آمریت کا دور شروع ہوا، تو فرق صرف ظواہر و رسوم میں تھا، روح ہر جگہ وہی کار فرما تھی۔ یعنی ایک انسان کا دوسرے انسان پر یا انسانوں کے ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر حکومت کرنا۔ عصرِ حاضر، مغرب کی جمہوریت کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیتا ہے اور بڑے فخر و ناز سے دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے انسانیت کو ازمنۂ متوسط کے شخصی استبداد سے نجات دلا کر آزادی کی فضا میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' فرق صرف قالب میں ہے' روح وہی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیراز نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جمہوریت ہو یا آمریت، زمانۂ قدیم میں ہو یا عصرِ حاضر میں، نظامِ حکومت کی بنا اس پر قائم ہے کہ صاحبِ اقتدار کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق قانون بنائے اور دوسروں سے ان قوانین کی اطاعت کرائے۔ جمہوریت میں اکیاون (۵۱) کی اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ اُنچاس (۴۹) کی اقلیت سے اپنا فیصلہ بہ جبر منوائے۔ مثلاً اگر کسی اسمبلی یا کیبنٹ میں یہ سوال پیش ہو کہ خدا ہے یا نہیں؛ اور اکیاون[۵۱] آراء خدا کی ہستی کے خلاف ہوں، تو اُنچاس[۴۹] آراء والی جماعت کو ماننا پڑے گا کہ واقعی (نعوذ باللہ) خدا نہیں ہے، اور یہی فیصلہ پھر ملک کا قانون بن جائے گا جسے "انتظام" (ADMINISTRATION) یعنی قوت کے دباؤ سے منوایا جائے گا، اور اس فیصلہ کے خلاف آواز اٹھانے والے کو حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا۔ یہی اصول آمریت کے اندر جلوہ پیرا ہے۔ جمہوریت میں جو شخص اراکین کی اکثریت اپنے ساتھ ملا لے وہی صاحبِ اختیار ہو جاتا ہے۔ البتہ اس میں ہوتا یہ ہے کہ ایک ایک معاملہ الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس میں رائے شماری کی رسم پوری کر لی جاتی ہے، اور آمریت میں ایک ہی مرتبہ ان رسمی تکلفات کو طے کر لیا جاتا ہے۔ قوم ایک ہی دفعہ فیصلہ کر کے (بجبر یا برضا و رغبت) ایک شخص کے ہاتھ میں زمامِ اختیار دے دیتی ہے اور پھر اس شخص کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ قوانین (جمہوریت کے ہوں یا آمریت کے) آخری اور اٹل ہوتے ہیں اور ان کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، جمہوریت ہو یا آمریت، جماعتی حکومت ہو یا شخصی، انسان نے ہر اندازِ حکومت سے اِبا کیا ہے۔ اس لئے کہ ہر طرزِ حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی جاتی ہے کہ بعض انسانوں کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ اور چونکہ خلافِ شرفِ انسانیت ہے[۱]، اس لئے انسان غیر محسوس اور غیر شعوری طور پر اس کے خلاف اپنے سینے میں بغاوت کے جذبات موجود پاتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک عرصہ کی "خوئے غلامی" سے اس کی قوتِ تمیز دب چکی ہوتی ہے، اس لئے اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کونسی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے اس کے سینے میں اس طرزِ زندگی کے خلاف طوفان جذبات برپا ہوتا رہتا ہے۔ اس اضطرابی کیفیت میں وہ کرتا یہ ہے کہ اس نظام کو اُلٹ دیتا ہے جو اس کے سامنے

---

[۱] انسان تو ایک طرف، حیوانات کی یہ حالت ہے کہ کوئی حیوان اپنے کسی ہم جنس کی حکومت قبول نہیں کرتا، اس کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

موجود ہوتا ہے اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کرتا ہے جس کے متعلق سمجھ لیتا ہے کہ اس میں اسے اطمینان وسکون حاصل ہو جائے گا حالانکہ یہ دوسرا نظام بھی انہی غلط بنیادوں پر قائم ہوتا ہے جن پر پہلا نظام قائم تھا. لہٰذا انسان کی کیفیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ؎

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ کے اوراق اُلٹتے جایئے (چند صفحات کے سوا) ہر صفحہ پر لکھا ملے گا کہ ؎

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

انسان کی عام حالت اس مریض کی سی رہی ہے جسے یہ تو معلوم نہ ہو کہ مجھے مرض کیا ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہو کہ میں تندرست نہیں ہوں. پھر وہ ہر نئے علاج کے وقت بلاساختہ پکار اُٹھے کہ بس یہ ہے تریاق! لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے مزعومہ تریاق کے شیشے پھوڑ ڈالے، اور کسی نئے تریاق کی جستجو میں چل نکلے اور اس کی تمام عمر انہی تجربوں میں بسر ہو جائے۔

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (۲/۲۰)

جب ذرا بجلی چمکی تو دو قدم چل پڑے اور جب پھر اندھیرا ہو گیا تو ٹھٹک کر رہ گئے۔

ایک نئی آواز

انسانیت اسی تگ وتاز، اسی اضطراب وانتشار میں اُلجھی، تڑپتی مرغِ بسمل کی طرح یوں پھڑ پھڑاتی چلی آ رہی تھی کہ ؎

ہر قدم پر تھا گماں، یاں رہ گئی واں رہ گئی

کہ آج سے قریب چودہ سو برس پہلے حظیرۂ قدس کی ایک دلکش آواز اس کے کانوں میں آئی کہ آؤ تمہیں بتایا جائے کہ تمہارے دکھ کا درماں کیا ہے. اس مرض کی دوا کونسی ہے؟ تم نے کہاں غلطی کی ہے اور اس کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے. اس آواز نے بتایا کہ تمہاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ایک انسان کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے. یہ غلط ہے، اور خلافِ شرفِ انسانیت. یاد رکھو.

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)

حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے جو تمام انسانوں سے بلند و بالاتر ہستی ہے.

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آذری

اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ تمام انسان ایک سطح پر ہیں اور برابر ہیں اس لئے کہ کوئی کسی دوسرے پر بالادست نہیں ہو سکتا۔ بالادست صرف وہ ہستی ہے جو فی الواقعہ انسانوں سے بالاتر ہو اور وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ حتّٰی کہ وہ برگزیدہ ہستیاں جو نوعِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے انتخاب کر کے بھیجی جاتی رہی ہیں انہیں بھی یہ حق نہیں کہ انسانوں کو اپنا غلام بنالیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکم و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم اللہ سے ورے میرے غلام بن جاؤ (بلکہ وہ یہی کہے گا کہ) تم سب ربانی بن جاؤ اس کتاب کے ذریعے جو تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور دلوں پر نقش کرتے ہو۔

یہ قوانینِ الٰہی جن کے اتباع سے انسانوں کو ہر نوع کی غلامی کا طوق اتار کر فقط اللہ کا غلام بننا تھا' اس کتابِ مقدس' اس صحیفۂ آسمانی میں منضبط ہوتے جو ان حضراتِ انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا۔ قرآن کریم میں مختلف انبیاء کرام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)

اور (اللہ نے) ان پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ' تاکہ وہ ان امور میں' جن میں لوگ اختلاف کرتے ہوں' حکم دیں (فیصلے کریں)۔

جو ان قوانینِ الٰہیہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ خدا کا عملاً منکر ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝)

(۵/۴۵ ، ۴۴)

اور جو قوانینِ خداوندی کے مطابق حکومت نہ کرے تو ظالمین میں سے ہوگا۔ کافرین میں سے ہوگا۔

یہ قوانینِ خداوندی مختلف زمانوں میں' مختلف اقوامِ عالم کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے لیکن چونکہ وہ یا تو حوادثِ ارضی و سماوی سے محفوظ نہ رہ سکے یا ان میں انسانی ہاتھوں نے ردّ و بدل کر ڈالا' اس لئے ان کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن کریم کی شکل میں دنیا کو دیا گیا اور یہ ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا کہ اب اس آخری پیغام میں

قیامت تک کسی قسم کا ردّ و بدل اور تحریف و الحاق نہیں ہو سکے گا۔ اس ضابطہ خداوندی کی غرض و غایت یہی تھی کہ نظامِ حکومت اسی کے مطابق ہو۔ توریت و انجیل کے ذکر کے بعد فرمایا:۔

قانونِ خداوندی کا اتباع

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ (۵/۴۸)

اور ہم نے (اے رسول!) تمہاری طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے جو اُن تمام کتبِ سماوی کے دعاوی کو سچا کر کے دکھانے والی ہے جو اس سے پیشتر دنیا کو مل چکی ہیں اور ان کے قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ پس اس ضابطہ خداوندی کے مطابق لوگوں میں (نظام) حکومت قائم کرو اور لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو' ورنہ وہ تمہیں اس راستہ سے ہٹا دیں گے جو تمہیں حق و صداقت کے ساتھ دیا گیا ہے۔

یہ قوانین چونکہ اس خدائے کائنات کے مرتب فرمودہ ہیں جو رب العالمین ہے' جو تمام نوعِ انسانی کا یکساں پروردگار ہے' اس لئے ان میں کسی خاص جماعت' خاص قوم' خاص ملک' کی کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کتنے ہی بلند درجہ پر کیوں نہ ہوں' ان میں ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنی جماعت کے مفاد کی طرف میلان ضرور ہوگا۔ جب تک انسان کے سینے میں دھڑکنے والا دل موجود ہے وہ جذبات سے مبرّیٰ نہیں ہو سکتا' اور جذبات کا تقاضا ہے کہ وہ امیال و عواطف کی رنگینی قبول کر لیں۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند' نہ بیند سودِ غیر

برعکس اس کے خدائے رب العالمین ان جذبات سے منزّہ و مبرّیٰ ہے' اس لئے اس کے وضع کردہ قوانین میں کسی خاص سمت جُھک جانے کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہاں ہر معاملہ اصول پر مبنی ہوگا اور ایک خاص قاعدے اور قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ ہوگا۔

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ (۵۷/۲۵)

بلا ریب ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب یعنی قوانین عدل و

انصاف نازل کئے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

علاوہ ازیں، دنیاوی نظامِ حکومت میں کوئی نہ کوئی منزل ایسی آئے گی جہاں پہنچ کر قوانین کے وضع یا نافذ کرنے والے خود قانون کی حد سے بالا ہو جائیں گے، یا کم از کم ان کے فیصلوں کی اپیل کہیں نہیں ہو سکے گی۔ ڈکٹیٹر شپ[1] جو انسانی حکومت کے سلسلۂ ارتقاء میں آخری سمجھی جاتی ہے، اسی اصول پر مبنی ہے کہ ڈکٹیٹر کا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور وہ خود قانون سے بالاتر۔ سٹالین اپنی کتاب "لینن" میں خود لینن کے الفاظ نقل کرتا ہے کہ:-

"ڈکٹیٹر کے معنی ہیں قوت، غیر محدود قوت، ایک قاہرہ قوت، جو آئین و دستور سے بلند ہو اور اس کا ہر لفظ قانون ہو۔"

اٹلی کے ہر مدرسہ کی دیوار پر فسطائیت کے دس اصول آتشیں حروف میں لکھے جاتے ہیں جن میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ مسولینی کا ہر لفظ قانون ہے وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ المانیہ میں ہٹلر کا ہر اشارہ قانون بن کر نافذ ہوتا ہے۔ شاہِ انگلستان کے متعلق بھی دستور و آئین میں یہ شق رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں ابھی پچھلے دنوں (مہاتما) گاندھی کے متعلق علانیہ کہا گیا کہ وہ منزہ عن الخطاء ہیں۔ یعنی ہر جگہ اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ نظامِ آئین و دستور میں سب سے اوپر کی کڑی کسی کی مطیع و فرماں بردار نہ ہو۔ اس کے برعکس نظامِ خداوندی میں کوئی کڑی بھی ایسی نہیں ہوتی جو قانونِ خداوندی کے احاطۂ اطاعت و اتباع سے باہر نکل جائے۔ بلکہ وہاں تو اطاعت اور بلندیٔ مدارج لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی جتنا بلند ہوتا ہے اُسے اتنی ہی زیادہ اطاعت کرنی پڑتی ہے، اور وہ جتنی زیادہ اطاعت کرتا ہے اسی نسبت سے اسے سرفرازی اور سربلندی کے مدارج عطا ہوتے ہیں۔ نظامِ خداوندی میں ذاتِ رسالت مآبؐ کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ظاہر و باہر ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن خود حضورؐ کے لئے سب سے بڑے شرف کا مقام عبدہٗ ہے۔ اللہ کے غلام، اس کے مطیع و فرمانبردار اور قوانینِ خداوندی کی سب سے زیادہ اتباع کرنے والے۔ ارشاد ہے:-

---

[1] اس زمانے میں اسٹالین، روس کا ڈکٹیٹر، مسولینی، اٹلی کا ڈکٹیٹر اور ہٹلر، جرمنی کا ڈکٹیٹر تھا۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)

جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو۔

نظامِ کائنات

اس نظامِ کائنات کا ایک ایک ذرّہ اطاعت کے اٹل اور بے پناہ قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر سورج کا عظیم الشان کرّہ ایک سیکنڈ کے سویں حصّے کے برابر بھی اس قانونِ اطاعت میں تساہل برتنے تو یہ تمام نظامِ شمسی دُھنی ہوئی رُوئی کے گالوں کی طرح فضائے آسمانی میں اڑتا نظر آئے۔ خاک کے ایک ادنیٰ ذرّے سے لے کر ان بڑے بڑے محیر العقول کرّوں تک' تمام کے تمام ایک بلند و بالا قانون کے مطیع و منقاد ہیں۔ اسی سے یہ سلسلۂ نظم و ضبط قائم ہے۔ جب کائنات کا نظم و نسق ہی یہ ٹھہرا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فطرت کا یہ منشاء ہو سکتا ہے انسان کے لئے کسی منزل (اسٹیج) پر پہنچ کر اطاعت کا قانون غیر ضروری قرار پا جائے۔ لیکن انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر کسی نہ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو اطاعت کے قانون سے مستثنٰی کیا جائے۔ اس لئے کہ وہی جماعت خود قانون ساز ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ دوسرا بنیادی نقص جو دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ نظامِ حکومت میں موجود رہتا ہے اور جس کے دُور کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جمہوری نظام میں مجلسِ واضعین قوانین کا ہر رکن قانون کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسرے انسان۔ اس لئے وہ جماعت کے قانون سے مستثنٰی نہیں ہوتی۔ لیکن جس جماعت کے اختیار میں ہو کہ جس وقت چاہے کوئی قانون بنالے اور جب جی چاہے اس میں ردّ و بدل کر دے یا اسے منسوخ ہی کر ڈالے' تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جماعت کس وقت تک اطاعت کی مکلف رہے گی؟ صرف اس وقت تک جب اسے اس قانون کی اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہو۔ جب اسے اس اطاعت میں نقصان معلوم ہوگا' وہ جھٹ سے قانون بدل ڈالے گی۔ جب یہ حالت ہو تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ جماعت قانون کی اطاعت پر مجبور ہے؟ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ خود قانون اس جماعت کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان ہر دو اہم اور بنیادی نقائص کو الگ کر کے رکھ دیا' جب اس نے فیصلہ کر دیا کہ:

(۱) کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں یہ حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو حاصل ہے ـــ اور

(۲) کوئی انسان ایسا نہیں جسے قانون کی اطاعت سے مستثنٰی قرار دیا جائے۔

اور یہ نقائص اسی صورت میں دُور ہو سکتے ہیں جب قانون کے اصول انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں، بلکہ انسانوں سے اعلیٰ وارفع ہستی کے متعین فرمودہ ہوں. اللہ تعالیٰ کے اس ضابطۂ قوانین کے ماتحت کسی انسان کو قانون سازی کا حق باقی نہیں رہتا. ان کے سپرد صرف یہ خدمت ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات و فروعات کو ترتیب دیں اور پھر دنیا میں ان قوانین کو نافذ کریں. جب دنیا میں نظامِ آئین و دستور کی یہ شکل پیدا ہو گی تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ انسان کو فی الواقعہ

صحیح آزادی

آزادی حاصل ہے، کیونکہ اس وقت کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہو گا. اس وقت یہ تمام اغلال و سلاسل جو بالادست انسانوں نے زبردست انسانوں کی گردن میں، مختلف نام دے کر، ڈال رکھے ہیں، ایک ایک کر کے اُتر جائیں گے اور انسان خدا کی اس کھلی فضا میں اطمینان کا سانس لے گا اور سر اونچا کر کے چل سکے گا. اس وقت وہ محسوس کرے گا کہ ؎

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را نہ او کس را غلام
رسم و راہ و دین و آئینش زحق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش زحق

قرآنِ کریم نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصدِ عظیم یہی قرار دیا ہے جب فرمایا کہ آپ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ:-

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)

وہ ان تمام طوق و سلاسل کو اتار دیں جو انسانیت کی گردن میں پڑے ہوئے ہیں. اور یوں انسانوں کو اس بوجھ سے سبکدوش کر دیں گے جن کے نیچے وہ دب رہے ہیں.

حضورؐ اس مقصدِ عظیم کو لے کر تشریف لائے اور اپنی مختصر سی حیاتِ طیبہ میں اپنے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس سطحِ ارض پر خدا کی بادشاہت کیسے قائم کی جا سکتی ہے جس میں "انسان" اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ ہو. جب اس نظام کی تکمیل ہو گئی تو ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھ لیا کہ "جنتِ ارضی" اسے کہتے ہیں. اس نظام کی تکمیل کے بعد نبی اکرمؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض

آج زمانہ مختلف چکر کاٹ کر اپنی اصلی ہیئت پر پہنچ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیقِ کائنات کے دن بنایا تھا.

یعنی آج انسانیت اس فضا میں پہنچ گئی ہے جو اس کے شرف و تکریم کے عین سازگار تھی اور جسے انسانی

جذبۂ تغلب و تسلط کی دسیسہ کاریوں نے اس قدر مکدر کر رکھا تھا۔ یہ فضا کیا تھی۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ (۳۰/۳۰)

دینِ قیّم اللہ کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا اور جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے دینِ قیّم (ایک محکم اور مضبوط قانونِ حیات) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہ "دِیْنِ قَیِّم" کیا ہے، اسے وعظِ یوسفی کے الفاظ میں سُنیئے۔ فرمایا:۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ (۱۲/۳۹)

اے قید خانے کے ساتھیو! ذرا سوچو تو سہی کہ کیا مختلف اور متفرق خدا" (آقا) اچھے ہیں یا ایک خدا جو تمام قوتوں کا مالک ہے؟

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (۱۲/۴۰)

تم اللہ سے ورے جن آقاؤں کی محکومی اختیار کر لیتے ہو ان کی حقیقت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے کچھ نام مقرر کر رکھے ہیں (اصطلاحات وضع کر چھوڑی ہیں)۔

مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (۱۲/۴۰)

ان "خداؤں" (آقاؤں) کی محکومی اختیار کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (۱۲/۴۰)

یاد رکھو! حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ (۱۲/۴۰)

اس نے حکم دے رکھا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

یہ ہے دینِ قیّم۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔

○

بابِ دوم

اس مختصر سے مضمون میں یہ بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ اس نظامِ زندگی میں، جو حکومتِ الٰہی کے ماتحت مرتب ہوتا ہے، یہ دنیا، جسے انسانی چیرہ دستیوں نے جہنم زار بنا رکھا ہے، کس طرح امن و سکون کی جنت بن جاتی ہے.

دولت اور قوّت

اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، البتہ اس وقت ہم ان دو اصولی باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن کی غلط بنیادوں کی وجہ سے انسانیت کا گلا گھٹ رہا ہے. اور اضطراب و عدم اطمینان کی آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ رہے ہیں. یہ دو بنیادی چیزیں ہیں. دولت اور قوت (WEALTH, PROPERTY & POWER) کی غلط تقسیم اور ان کا غلط استعمال. تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ دولت اور قوت کا بے جا استعمال ہی تمام فتنہ سامانیوں کا سرچشمہ ہے. اجمالاً دیکھئے کہ ضابطہ خداوندی ان دونوں فتنوں کا کس طرح سے سدِ باب کرتا ہے اور انہیں کس طرح، حدود و قیود کی پابندیوں میں گھیر کر، ان سے ایسا کام لیتا ہے جیسے کسی انجن میں بھاپ ہو چند موٹے موٹے عنوانات پر غور فرمائیے.

(۱) زمین کسی کی ملکیت نہیں

زمین پر ذاتی قبضہ اور اس کی ناہموار تقسیم دنیا میں عظیم الشان فتنوں کا باعث بنی رہی ہے اور بن رہی ہے. ایک شخص کے پاس دس ہزار بیگھے زمین ہے جس پر وہ بلا شرکتِ غیرے قابض ہے اور وہ باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہوتی چلی جا رہی ہے. اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص ہے جسے سال بھر کے اناج کے لئے زمین کا ٹکڑا نہیں ملتا. اس کے لئے وہ "زمین کے مالک" کا محتاج ہے. وہ دن کی چلچلاتی دھوپ اور رات کے کڑکڑاتے جاڑے کی محنت کا ماحصل زمین کے مالک کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے اور اپنے بچوں کی روٹی کے لئے اس کے ہاتھوں کی طرف تکتا ہے.

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

قرآنِ کریم زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا. اس کے نزدیک زمین، رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس کی تقسیم، لوگوں کی محنت اور ضرورت کے اعتبار سے ہونی چاہیئے اور اس کا نظم و نسق اس جماعت کے ہاتھ میں جو حکومتِ الٰہی کے قیام کے لئے متمکن ہو. سرحد کے آزاد قبائل کے متعلق کہتے ہیں کہ وہاں آج بھی یہ حالت

ہے کہ گاؤں کا خان ہر تیسرے یا پانچویں برس "بندوبست" کی تجدید کرتا ہے اور ہر شخص کی ضرورت اور محنت کے مطابق زمین کے ٹکڑے تقسیم کر دیتا ہے. زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ مدت کے لئے فائدہ حاصل کرنے کے لئے عطا فرمایا ہے (مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ) نہ کہ اس پر سانپ بن کر بیٹھ جانے کے لئے.

حق زمیں را جز متاع ما نگفت　　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر　　　رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

باطنِ الارض للہ ظاہر است　　　ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست　　　ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

صرف زمین ہی نہیں بلکہ رزق کے جس قدر چشمے مبدا فیض کی کرم گستری سے انسان کو مفت عطا ہوتے ہیں، قرآن کریم انہیں ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے تاکہ ہر شخص اپنی محنت اور ضرورت کے مطابق ان سے متمتع ہو. فرمایا:-

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي

أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝ (۴۱/۱۰)

اور (اللہ نے) زمین کی سطح پر پہاڑ پیدا کئے اور اس میں (ایسی چیزیں پیدا کیں جو موجبِ) برکات ہیں اور اس میں چار فصلوں میں خوراک کے سامان پیدا کئے (ان سب کے دروازے) ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کشادہ ہیں.

(۲) دفائن و خزائن

قرآن کریم انسان کو اس کی محنت کے ماحصل کا مالک قرار دیتا ہے. لیکن اس کی اجازت کبھی نہیں دیتا کہ دولت کے انبار جمع کر کے رکھ لئے جائیں، کیونکہ دولت کے تو معنی ہی "گردش کرنے" کے ہیں. جب وہ گردش (CIRCULATION) سے رک جائے تو دولت نہیں رہتی، نوعِ انسانی کے لئے عذاب بن جاتی ہے. اس لئے دولت کو روک رکھنے والوں کے لئے سخت وعید آئی ہے. ایک جگہ فرمایا.

کس قدر بدبختی ہے اس کے لئے جو دولت کو جمع کرتا ہے اور پھر اُسے گنتا رہتا ہے (کہ اس میں کتنا اضافہ ہوا) کیا یہ سمجھتا ہے کہ یہ دولت اس کے پاس ابدالآباد تک رہے گی؟ کبھی نہیں! بلکہ یہ تو اسے ایک ایسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے جہنم میں لے جائے گی جس کی آگ کے شعلے

دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۲-۶)

دوسری جگہ فرمایا:۔

جو لوگ چاندی اور سونے کے دفینے بنا رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں ایک دردناک عذاب کی بشارت دیجئے جس دن ان سکوں کو آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانی اور پہلو اور کمر کو داغ دیا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ ہاں!) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے روکے رکھا تھا۔ سو اب اس کے روکنے کا مزہ چکھو۔ (۹/۳۴-۳۵)

(۳) روپیہ کی گردش

دنیا میں آج دولت کی اس قدر فراوانی ہے کہ ازمنۂ سابقہ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی لیکن بایں ہمہ دنیا میں جس قدر بھوک اور افلاس آج ہے اس کی بھی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ ماہرینِ اقتصادیات اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ روپیہ کی گردش (CIRUCLATION) صرف اوپر کے طبقہ میں رہتی ہے۔ روپیہ نیچے نہیں اُترتا۔ قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو برس پیشتر، جب دنیا معاشیات کے جدید اصولوں سے ناآشنا تھی، کس قدر واضح الفاظ میں فرمایا کہ روپیہ کی گردش اس انداز سے مت کرو کہ

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷)

وہ تمہارے امراء کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے۔

(۴) سُود

آج دنیا کی مہیب ترین لعنتوں میں سب سے بڑی لعنت سُود ہے۔ یعنی روپیہ کسی ایسی جگہ سے، جہاں وہ بلاضرورت پڑا ہے، ایسی جگہ آتا ہے جہاں اس کی احتیاج ہے، تو وہ سود کی لعنت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ ضابطۂ خداوندی کی رُو سے سُود وہ جرمِ عظیم ہے کہ جسے "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" قرار دیا گیا ہے (۲/۲۷۹)۔

از رِبا آخر چہ می زاید؟ فتن کس نداند لذّتِ قرضِ حسن
از رِبا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ آدمی درندہ بے دندان و چنگ

○

کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ہم نے حکومتِ الٰہی کے اس شعبۂ نظام کے متعلق صرف اشارات پر اکتفا کیا ہے، تفصیل اس اجمال کی طویل ہے۔

لیکن اس نظام کا عملی اور زندہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو اس نظام کی حفاظت میں لے آتا ہے وہ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عہد کے کیا معنی ہیں کہ:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

رُوئے زمین پر کوئی ایسا جاندار نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔

دیکھنے کو تو یہ آیتِ مقدسہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن غور فرمایئے کہ اس کے اندر نظامِ انسانیت، کا کس قدر مہتم بالشان اصول کارفرما ہے۔ کیا انسان اپنے دماغ سے کوئی ایسا نظام وضع کر سکا ہے جس میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری نظامِ مملکت نے اپنے سر لے لی ہو؟ انسانی حکومت کی تاریخ کے کسی دَور میں بھی آپ کو یہ چیز نہیں ملے گی۔ سب سے پہلی مرتبہ اس کا اعلان حکومتِ الٰہیہ کی طرف سے ہی ہوا اور اسی نے ہمیں بتایا کہ

کس نماند درجہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

یہ چیز آپ کو صرف اسی نظام میں ملے گی کہ اُمت کا بلند ترین فرد امیر المومنین روٹی کا ایک لقمہ اپنے مُنہ میں نہیں ڈال سکتا جب تک اسے پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ جس حلقہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد پیٹ بھر کر سکھ کی نیند سو گیا ہے۔ آج انسان کی حالت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ پر ضابطۂ خداوندی کی بجائے اپنے خود ساختہ ضوابط کو مسلّط کر رکھا ہے اور جب اس نظام کے نتائج بھوک، افلاس، ذلت و نکبت، پریشانی و تباہ حالی کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو اس کا الزام خدا پر دھرتا ہے۔ اور اس کے بعد ان مصائب کا حل پھر کسی اپنے ہی متعین کردہ نظام میں تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے آپ کو خدا کے نظام کے حوالے کر دے تو پھر دیکھے کہ یہ تمام مشکلات کس طرح خود بخود آسان ہو جاتی ہیں؛ نظام اپنے اوپر مسلّط کر لینا طاغوتی اور نتائج تلاش کرنے ملکوتی! اگر کھلی ہوئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ زلزلہ میں بوسیدہ مکان کے اندر پناہ لینے والے کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ذرا خدا کی چھت کے نیچے آیئے اور پھر دیکھئے کہ وہ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے یا نہیں؟

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ
لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ (۲/۲۵۶)

جو غیر خدا (کے سرکش نظام) سے مُنہ موڑ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے تو اسے ایک ایسا محکم اور پائیدار سہارا مل جاتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

یہ "پائیدار سہارا" وہ نظامِ خداوندی ہے جس کے بعد دنیا کے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ انسان کی ذہنیت بدل دیتا ہے۔ ساری دنیا کی کیفیت بدل دیتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود ۔۔۔ جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود

○

قوّت (POWER)

اس عالمِ کون وفساد میں دوسرا انسانیت سوز فتنہ قوّت کا غلط استعمال ہے۔ قوّت درحقیقت دولت ہی کے عملی نتیجہ کا نام ہے۔ سرکشی وتمرّد، استبداد و فرعونیت، بلا گنج قارون کہاں پنپ سکتی ہے۔ پھر جس طرح دولت بجائے خویش بُری چیز نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال ہلاکت آفریں ہے، اسی طرح قوت کے اندر بھی بجائے خود کوئی خرابی نہیں، البتہ اس کا بیجا استعمال تباہی و بربادی کا ایسا بلا انگیز طوفان پیدا کرتا ہے کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

حکومتِ الٰہی میں قوت پر ایسی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں کہ وہ ایک سرکش طوفان بننے کے بجائے ساحلوں میں گھرا ہوا دریا بن جاتی ہے جس سے ہزار قسم کے فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ نظامِ خداوندی میں قوت، ظلم و ستمگری کی حمایت کے لئے نہیں، بلکہ ظالم و قہرماں کا جَور و ستم روکنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ وہ غاصب و سفاک کی شمشیر بے نیام نہیں بنتی بلکہ مظلوم و ستم رسیدہ کے لئے سپر کا کام دیتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ قوت،

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

○

آزادیٔ مذاہب

تاریخِ عالم شاہد ہے کہ استبداد کا آہنی پنجہ سب سے پہلے حریتِ فکر اور آزادیٔ مذہب کا گلا گھونٹتا ہے۔ ساحرینِ فرعون نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق و صداقت حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی طرف ہے تو انہوں نے بلا تأمل اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ اس پر فرعون کی

آنکھوں سے جلال کے شرارے نکلنے لگے۔ غضب وانتقام کا سیلاب جوش میں آگیا۔ قوت کے نشے میں بپھر کر بولا۔

اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ..... (۲۰/۷۱)

ہیں! تم اس پر میری اجازت کے بغیر ہی ایمان لے آئے!! اب دیکھو کہ میرا انتقام کیا کرتا ہے۔ ابھی تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تمہیں سُولی پر لٹکاتا ہوں۔

یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ دنیا کی تاریخ کے ایک ایک ورق پر اس قسم کے واقعات خون کے حروف سے لکھے ملتے ہیں۔ لیکن یہ اعلان آپ کو حکومتِ الٰہی کے دربار ہی سے ملے گا کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲/۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔ ہدایت اور گمراہی واضح ہو چکی۔

اس لئے

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹)

جس کا جی چاہے ایمان لے آئے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

حکومتِ خداوندی میں مذہب کے معاملہ میں صرف آزادی ہی نہیں، بلکہ وہاں ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ مسلمان صاحبِ قوتِ واختیار ہوں تو ان پر لازم آتا ہے کہ بوقتِ ضرورت دیگر اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں۔ اس لئے کہ

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ (۲۲/۴۰)

اگر اللہ بعض انسانوں (کی قوت) کے ذریعہ دوسرے انسانوں (کی سرکشی) کی روک تھام نہ کرے تو زہاد کے خلوت خانے، نصاریٰ کے گرجے، یہودیوں کے صومعے اور مسلمانوں کی مسجدیں سب منہدم ہو جائیں۔

عدل و انصاف

اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی قوم تمہارے ساتھ دشمنی کرے تو تم ان کے بارے میں عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یہ نہ ہو کہ ان کی عداوت کی بناء پر تمہارے دل میں انتقام کے جذبات پیدا ہوں، اور ان جذبات کی تسکین کے لئے تم بے انصافی پر اُتر آؤ۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے بےانصافی کرنے لگو۔

آپ اقوامِ گذشتہ کی تاریخ کے اوراق اُلٹتے جائیے۔ سیاستِ عصرِ حاضرہ پر گہری نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کہیں، کسی ایک جگہ بھی، آپ کو یہ بلند اصول دکھائی دیتا ہے؟ کیا انسانوں کے وضع کردہ نظام و دستور میں یہ ممکن ہے کہ معاندت و عداوت کا جواب عدل و انصاف سے دیا جائے؟ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ دشمن برسرِپیکار ہے۔ اس کی قوم کا کوئی فرد آپ سے پناہ کا طالب ہے۔ ارشاد ہے کہ اسے پناہ دو۔ خدا کا کلام سناؤ۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں واپس جانا چاہے تو اپنی حفاظت میں اُسے اس کی جائے امن تک پہنچا دو (۹/۶)۔

"جنگ اور قرآن کریم" کے عنوان پر کسی دوسری فرصت میں مفصل[1] لکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ خدا کی حکومت میں جنگ، فتنہ و فساد کے استیصال کی خاطر ہے، نہ کہ فتنہ و فساد پھیلانے کی غرض سے۔ اگر مقصد محض تسخیرِ ممالک ہو، جوع الارض کی تسکین ہو، تو وہ جنگ سلطنت کی جنگ ہو جاتی ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اگر جنگ کی غرض جور و استبداد کی بجائے حکومتِ الٰہی کا قیام ہو جس میں انسانیت کو صحیح آزادی حاصل ہوتی ہے، تو یہ جنگ عین منشائے خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک زہر آلود مہلک ناسور کا آپریشن مریض پر ظلم ہے۔

گر خدا باشد غرض جنگ است خیر   صلح، شر گردد چو مقصود است غیر
جنگ باشد قوم را نا ارجمند   گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند

جب قوت و اختیار، ضابطۂ خداوندی کے ماتحت، حاصل ہوتا ہے تو وہ جماعت جو قوانینِ الٰہی کے نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، اس انداز کی ہوتی ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (۲۲/۴۱)

وہ لوگ اگر متمکن فی الارض ہوتے ہیں تو اس لئے کہ نظامِ صلوٰۃ مستحکم کریں، نوعِ انسانی کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچائیں۔ ہر جگہ عدل و انصاف (نیک امور) کا حکم جاری کریں اور ظلم و تشدد کی بُری باتوں کی روک تھام کریں۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "معراجِ انسانیت" عنوانِ جہاد۔

اس جماعت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

عادل اندر صلح وہم اندر مصاف
وصل و فصلش لایراعی لایخاف

نہ وہ کسی کی بے جا رعایت کرتے ہیں، نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔ ان کی صلح اور دشمنی دونوں حق و انصاف پر مبنی ہوتی ہیں۔

یہ ہے اجمالی ساخاکہ اس حکومتِ الٰہی کا جس کے قیام کے بعد انسان، وحشت و درندگی، سبعیت و بربریت کی زندگی چھوڑ کر "صحیح" انسانیت" کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے جن کے بعد وہ اس نصب العین تک پہنچ سکتا ہے جس کا حصول اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔

وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔

اسلام اور مذہبی رواداری

(نوشتہ جون سنہ ۱۹۳۹ء)

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجۂ استبداد سے کم از کم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظم سازش کرتے۔ ایک آتے ہی کہتا۔ او ہو! قبلہ خیریت ہے آج نصیبِ اعدا کچھ طبیعت مضمحل سی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی رات کچھ دیر سے سویا، اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ دوسرا آتا اور السلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرے پر متردّدانہ نگاہ ڈال کر پوچھتا کہ مولانا خیریت ہے! آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ چہرے پر کچھ تمازت کے آثار بھی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھئی کچھ اعضا شکنی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تیسرا ابھی آکر بیٹھنے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب! مزاجِ گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آرہی ہے۔ اب مولوی صاحب کا دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا۔ فرماتے ہیں کہ ہاں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔ چوتھا طالب علم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے میں دراز ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے۔

پروپیگنڈے کا اثر

مولوی صاحب کے بخار آجانے کا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت، لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپیگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقع قلبِ ماہیت پیدا کر دیتا ہے۔ اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویئے بدل دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے۔ یہی وہ سحرِ سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ (۷/۱۷۹) آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں کان

اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ " (۷/۱۷۹) بالکل "ہز ماسٹرز وائس" ہوتے ہیں۔

اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں یہی ہوا۔ اس نے بھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے اربابِ حل و عقد کو اس سے خواہ مخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے اس کا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خط و خال میں کہیں ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔ اربابِ سیاست کے پیشِ نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں۔ خداوندانِ مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لے کر اُٹھے اور زبان و قلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر، خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں۔ جب دولِ یورپ کا تسلّط دیگر ممالک پر ہوا تو انہوں نے وہاں بھی اس مقصد کو فراموش نہیں ہونے دیا، اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم قوم کی ہر ادا میں ایک شانِ خداوندی نظر آیا کرتی ہے، لہٰذا

اسلام کی تصویر

اقوامِ یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو ایڈیشن شائع کئے، دل و دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کرا کے رکھ لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے، قتل و غارتگری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خونریزی، جور و تظلّم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن میں نظر آتا ہے کہ (معاذ اللہ) وحشی و خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں، سیلِ حوادث کی طرح کف بردہاں بڑھتے چلے آرہے ہیں، جن کے جلو میں سبعیت و بربریت کے مجسّمے، ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے، اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں اُمڈتے چلے آتے ہیں، اور اس قہرِ خداوندی، اس سیلابِ بلا، اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے، تہذیب و تمدّن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذہب و مسلک، ایک ایک کرکے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں، آسمان تک جاتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے گویا (نعوذ باللہ) اس خونخوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب پر بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں، بستیاں اُجڑ جاتی ہیں، کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں۔ تہذیب و تمدّن کے آئینہ دار قصرِ شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں۔ کسی جگہ زنار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امن ہے، نہ کلیسا کے راہب کے لئے امن۔ نہ عورتیں محفوظ

ہیں نہ بچے مصئون. کچھ قتل کر دیے گئے، جو باقی بچے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جارہے ہیں کہ وہاں انسانیتِ عظمیٰ دو دو ٹکوں میں فروخت کی جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ "تصویر" جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھوں کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے. حقارت و تنفر، انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اُٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں، اور اسے اس "عالم سوز تہذیب اور ننگِ انسانیت تمدّن" کو امن و سلامتی کی دنیا سے مٹا دینے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں. آیئے! آج کی مختصر سی صحبت میں دیکھیں کہ جس تصویر کو آپ کے سامنے اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے، اس کے صحیح خطوط کیا ہیں، اور جس تہذیب و تمدّن کو تلوار اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جارہا ہے اس کی اصلیّت کیا! اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جرأتیں فی الحقیقت قابلِ داد ہیں کہ یہ سب کچھ ایک ایسے دین کے متعلق پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل دستورِ اساسی، ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ، دنیا کے ہر کتب فروش کی دکان سے مل سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی اس بادشاہت میں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا. ہم اس وقت تاریخی اشہاد سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حکومتِ الٰہی میں پوری طاقت اور قوت ہوتے ہوئے محکوم و مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا تھا. اور انہیں مذہبی آزادی کس درجہ حاصل تھی. اس مضمون میں ہم تاریخی شہادات بالعموم غیر مسلم مصنفوں اور مؤرخوں کے حوالوں سے پیش کریں گے تاکہ کسی قسم کے تعصّب، جنبہ داری اور رجحانِ قلبی کا شائبہ نہ رہے. یہ بھی واضح رہے کہ وہ سلطنت جسے ہم "خدا کی بادشاہت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں قرونِ اُولیٰ کے ایک مختصر سے عرصے پر مشتمل تھی. اس کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اُسے آپ مسلمانوں کی سلطنت تو کہہ سکتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں خدا کی حکومت نہیں کہہ سکتے. بایں ہمہ اس حکومت میں بھی چونکہ مسلمانوں کے سامنے اسلامی روایات کے کچھ نہ کچھ نقوش موجود تھے، اس لئے غیر مسلموں سے رواداری کے باب میں اس زمانہ میں بھی ہمیں ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو دوسرے مذاہب کی سلطنتوں میں معدوم ہیں۔

اگرچہ غیر اقوام کے ساتھ ربط و ضبط عہدِ رسالت مآبؐ ہی سے شروع ہو گیا تھا اور فتحِ خیبر، یہود مدینہ اور فتحِ مکہ جیسے مقامات پر جس قسم کی رواداری کی مثالیں ملتی ہیں تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی عہدِ فاروقی سے اس کا سلسلہ بڑھا ہے. اور چونکہ اس عہد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی

کی کوشش کی گئی ہے اس لیئے ہم شروع میں اسی عہد کے چند ایک واقعات پر نظر ڈالتے ہیں. اسلامی عہدِ حکومت میں غیر ملکی رعایا کو ذمّی کہاجاتا تھا. جب یروشلم فتح ہوا ہے تو وہاں کے ذمیوں کے ساتھ ایک عہدنامہ

یروشلم کے عیسائی

ہوا. اس کے اقتباسات سے اندازہ لگایئے کہ بحیثیتِ فاتح، مغلوب و مفتوح قوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا.

"یروشلم کی غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال، اولاد اور عبادت گاہوں، صلیبوں اور ہر اس چیز کی جو ان کی ملکیت میں ہے حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے. ان کی زمینوں اور ان کے مذہب میں کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا. ان کے کلیساؤں کو نہ تو منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا. ان کے اوقاف اور ان کے وقار کو بحال رکھا جائے گا. اہلِ یروشلم کو اپنے مذہب کی پابندی میں ہر قسم کی آزادی ہوگی اور اُن پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہیں رکھا جائے گا۔[1]"

فتح یروشلم کے بعد جب حضرت عمرؓ گرجے کا ملاحظہ فرما رہے تھے تو نماز کا وقت آگیا. بطریق نے کہا کہ آپ وہیں نماز ادا کرلیں، لیکن آپ نے اس سے اس بنا پر انکار کردیا کہ مبادا بعد میں آنے والے مسلمان سنّتِ عمرؓ کی تقلید میں اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرلیں. تألیفِ قلوب، بالغ نظری اور مذہبی رواداری کا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے سرولیم میور جیسا متعصب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی کتاب (THE CALIPHATE ITS RISE AND FALL) میں اس کا ذکر کیا ہے. حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دیگر اقوامِ عالم میں مذہبی تعصب جنوں کی حد تک پہنچ چکا تھا. اسی یروشلم میں مسلمانوں کی فتح سے پیشتر ہرقل نے قیامت برپا کر رکھی تھی. فلسطین، شام، ایشیائے کوچک اور مصر سے تمام یہودیوں کے اخراج کا حکم عام تھا اور ان پر جس قدر مظالم توڑے جاتے اُن کی کبھی دادرسی نہ ہوسکتی تھی. غیر مذاہب والوں ہی سے نہیں، بلکہ عیسائی جو اس خاص فرقہ[2] سے متعلق نہ تھے جس کا ہرقل پیرو تھا، ہر قسم کے مظالم کا شکار ہوتے تھے، چنانچہ یعقوبی فرقہ کا ایک بطریق لکھتا ہے کہ:۔

"ہرقل نے اپنی مملکت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو عیسائی اس کے مشرب اور مسلک سے متعلق

---

[1] (THE ECLIPS OF CHRISTIANITY – BY LAWRENCE)

[2] (CHALCEDONIAN)

نہ ہو اس کی ناک اور کان کاٹ دیئے جائیں اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے۔ یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو ہرقل اپنے سامنے نہیں آنے دیتا تھا، لہٰذا ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ خدائے جبار نے بنی اسمٰعیل کے گھرانے سے ایک ایسی ہستی کو مبعوث کردیا جس نے ہمیں ظالم رومیوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی۔ چونکہ ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کے معاملہ میں تعرض نہ کیا۔ جو معبد کسی کے قبضہ میں تھا وہ اسی کے پاس رہنے دیا۔ اس لئے یہ تو نہ ہوسکا کہ ہمارے چند ایک گرجے جن پر ــــــــ رومی قبضہ کرچکے تھے واپس مل جاتے لیکن ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رومیوں کے مظالم سے چھوٹ گئے اور ہمیں عربوں کے ساتھ امن کی زندگی میسر آئی"۔[1]

مصر میں یہی حالت مصر میں تھی۔ ایک آرمینین عیسائی ابوصالح، جو تیرہویں صدی کے شروع میں گزرا ہے، لکھتا ہے:۔

"یہ ایسا وقت تھا کہ شہنشاہ (قیصر) قدیم مذہب کے پرستار عیسائیوں پر بے حد ظلم و ستم کرتا تھا اور انہیں زبردستی اپنے فرقے میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہرقل اور مقوقس کے ہاتھوں حقیقت پسند عیسائیوں نے بے حد تکالیف اٹھائیں۔ جب مظالم انتہا کو پہنچ گئے، تو ملتِ حنیفہ کی ایک قوم اٹھی، جس نے رومیوں کے نخوت اور تکبر کو توڑا اور مصر کو فتح کرکے یعقوبی فرقے کے عیسائیوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلائی"۔[2]

چنانچہ فتح مصر کے وقت حضرت عمرؓ بن عاصؓ نے تمام اہلِ مصر کو ایک شرائط نامہ لکھ کر دیا جس کی رُو سے ان کے املاک، نفوس اور اولاد سب محفوظ تھیں۔ انہیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے گرجے اور معبد بالکل مصئون تھے اور دشمنوں کے حملوں سے ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمّہ تھی۔[3]

۱۔ (CHRONIQUE DE MICHEL LE SYRIAN-II-412-413)

۲۔ (THE CHURCHES AND MONESTRIES OF EGYPT-PP. 30-31)

۳۔ THE PREACHING OF ISLAM ARNOLD)

دمشق میں

فتحِ دمشق کے وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بڑے بڑے مقنن اور سیاستدان سنتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں مسلم افواج دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں. ایک طرف حضرت خالدؓ تھے' دوسری طرف ابو عبیدہؓ. حضرت خالدؓ ایک رات خندق پار کر کے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے. نیچے اُتر کر دروازہ کھول دیا اور مسلم فوج درانہ شہر میں گھس آئی. عیسائیوں نے جب، یہ کیفیت دیکھی تو فوراً دوسری طرف جاکر چپکے سے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کر لی. چنانچہ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بحیثیتِ فاتح شہر میں بڑھتے چلے گئے' اور دوسری طرف سے ابو عبیدہؓ بحیثیتِ معاہد بڑھتے آئے. وسطِ شہر میں دونوں فریق آملے. نصف شہر بہر حال لڑائی میں فتح ہوا تھا' اور اس حصہ کے ساتھ ان شرائط کے ماتحت سلوک ہونا چاہیئے تھا جو اُن سے بحیثیت فاتح کے طے ہوئیں. لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ چونکہ انہوں نے اہلِ شہر سے صلح کر لی ہے اور وہ انہیں امان دے چکے ہیں' اس لئے ان سب کو حلیف ہی شمار کرنا چاہیئے. چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اہلِ شہر سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا. حالانکہ ایفائے عہد کے متعلق یونان کے مقننِ اعظم' سولن' نے لکھا ہے کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو اُلجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے."

"اے مسلمانو! ہم تمہیں بازنطینی حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں' حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں.
اس لئے کہ تم معاملہ میں ان سے کہیں بہتر ہو' اور ہم سے ہمیشہ عدل و انصاف سے پیش آتے ہو.
اور تمہاری حکومت ان سے بدرجہا اچھی ہے کہ انہوں نے تو ہمارے گھر بار ہم سے چھین لئے." [1]

حمص میں

حمص میں مسلمانوں نے کچھ عرصہ تک اپنی چھاؤنی رکھی. عیسائیوں کی افواج نے جب دوبارہ حملہ کیا تو حمص کے عیسائیوں نے اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان سے کہہ دیا کہ جاؤ' تم سے ان مسلمانوں کی حکومت ہزار درجہ بہتر ہے. چنانچہ جب مسلمانوں کو فوجی ضرورت کے ماتحت کسی دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو اہلِ شہر روتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے جلدی واپس آنا تاکہ ایسا نہ ہو کہ رومن عیسائی پھر ہم پر حکومت کرنے کو آجائیں [2]. اللہ اللہ!

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ زخویش بریدند و با تو پیوستند

---

[1] (THE PREACHING OF ISLAM-ARNOLD)

[2] (ECLIPS OF CHRISTIANITY.)

اسی حمص کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سال بھر کا خراج وصول کیا' لیکن چھ مہینے بعد انہیں دوسری جگہ جانا پڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ نصف خراج اہلِ شہر کو واپس کر دو کیونکہ جب ان کی حفاظت ہی نہیں تو اس حفاظت کے بدلے میں خراج کیسا؟[1] کیا ایسی مثالیں کسی اور تاریخ میں بھی آپ کو مل سکتی ہیں؟

جبلہ کا واقعہ جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب طوافِ کعبہ کے دوران' اس کی چادر ایک اعرابی کے پاؤں تلے آگئی تو اس نے اعرابی کے مُنہ پر طمانچہ مارا۔ اعرابی نے اس کا جواب' ویسے ہی طمانچہ سے دیا۔ شہزادہ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس کی شکایت کی' لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے نزدیک ایک شہزادہ اور ایک ادنیٰ دہقانی کا درجہ مساوی ہے۔ اس پر اس نے پھر سے عیسائی ہو جانا چاہا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں! ہمارے نزدیک تمہارے لئے تینوں راستے کھلے ہیں۔ یا مسلمان رہو' یا عیسائی ہو کر جزیہ ادا کرو۔ یا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔[2]

جزیہ مسلمانوں پر سب سے بڑا الزام جزیہ کے متعلق عائد کیا جاتا ہے اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم رعایا سے "جرمانہ" ان کے مسلمان نہ ہونے کے جرم کی بنا پر وصول کیا جاتا تھا' حالانکہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا (کم از کم) چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی۔ غیر مسلم رعایا جو مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہتی تھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر لازم تھی۔ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ ان سے فوجی خدمت کے بدلے تھوڑی سی رقم وصول کر لی جاتی تھی جس کی شرح زکوٰۃ سے کم تھی۔ نیز عورتیں' بچے' بوڑھے' اپاہج اور مذہبی رہنما' اس سے مستثنیٰ تھے۔[3]

یہ بھی دیکھئے کہ اس جزیہ کی مقدار کتنی تھی۔ معمولی حیثیت والے سے ۱۲/۱-۴ سالانہ۔ متوسط درجہ والے سے ۸ صہ اور اس سے آگے خواہ کوئی کروڑپتی ہو' زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سالانہ۔ حالانکہ (مثلاً) ایک کروڑپتی مسلمان سے

---

[1] (ECLIPS OF CHRISTIANITY.)

[2] (THE PREACHING OF ISLAM)

[3] (CALIPHS AND THEIR NON-MUSLIM SUBJECTS—TRITTON)

کم از کم ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا تھا۔ صدقات و خیرات اس کے علاوہ تھے۔ اور اس مالی قربانی کے ساتھ ساتھ جب ضرورت لاحق ہوتی تو یہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں بھی شریک ہوتا تھا اور ذمی رعایا کے مال، جان، مذہب، معابد کی حفاظت کرتا تھا۔ یعنی ایک ذمی رئیس بارہ روپیہ ادا کر کے نہایت اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھا رہتا اور اسی حیثیت کا ایک مسلمان ڈھائی لاکھ روپیہ ادا کرنے کے بعد اس ذمی کے محافظ کی حیثیت سے میدان کارزار میں دشمن کی شمشیر و سناں کا مقابلہ کرتا۔ دشمن کی گولیاں ہوتیں اور مسلمانوں کا سینہ، جو غیر مسلم رعایا کی حفاظت کے لئے سپر کا کام دیتا۔ مسلمانوں سے پہلے ساسانیوں نے عیسائی رعایا پر جو ٹیکس لگا رکھا تھا وہ ساسانی رعایا سے دوگنا ہوتا تھا اور اس کے جواز میں شاہ پرساد وم نے کہا تھا کہ لڑائی ہمیں لڑنی پڑتی ہے اور یہ مزے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ دوگنا کیوں نہ ادا کریں[1]۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں جب کوئی غیر مسلم فوجی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا تو اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے عیسائی قبیلے نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا[2]۔ اہلِ حیرہ نے جزیہ دیا تو اُن سے یہ شرط تھی کہ ان پر خواہ مسلمان حملہ آور ہوں، خواہ غیر مسلم، ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی[3]۔ ہم حمص کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مسلمان حفاظت کی ذمہ واری سے سبکدوش ہوئے تو باقی ماندہ زرِ جزیہ ذمیوں کو واپس کر دیا۔ کیا اس کے بعد یہی سمجھا جائے گا کہ غیر مسلموں سے جزیہ اسلام قبول نہ کرنے کے جرم کی پاداش میں وصول کیا جاتا تھا؟

ذمیوں کے حقوق

ذمیوں کے حقوق کا مسلمانوں کو اس قدر خیال رہتا تھا کہ حضرت عمرؓ کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

"میں ذمیوں کے حقوق اب اپنے جانشین کے سپرد کرتا ہوں۔ ان کو خدا اور رسولؐ نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس لئے میرے جانشین کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جو معاہدے ان کے ساتھ ہوئے ہیں ان کی شدت سے پابندی ہو اور ان پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہ ڈالا جائے"[4]

حضرت عمرؓ کے خلاف الزامات عائد کیے جاتے ہیں کہ انہوں نے مذہب کے معاملہ میں عیسائیوں پر کچھ

---

[1] [2] [3] (INTRODUCTION TO THE HISTORY ASSYRIAN CHURCH---ARNOLD)

[4] طبقات ابنِ سعد جس کی تائید آرنلڈ نے بھی کی ہے۔

پابندیاں عائد کر رکھی تھیں. لیکن سر تھامس آرنلڈ نے وغیرہ کے حوالہ سے اس کی تحقیق کی ہے کہ یہ تمام الزامات بعد کی اختراع ہیں. اس کے برعکس یہ واقعات بھی حضرت عمرؓ کے عہد ہی کے ہیں کہ انہوں نے ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا اور اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ اس مسلمان کو ذمی کے قتل کے بدلے میں قتل کرا دیتے. انہوں نے تمام زمینیں ذمیوں کے قبضہ میں رہنے دیں اور یہ حکم دے دیا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کی زمین خرید نہیں سکتا. ذمیوں کے علاقہ کے متعلق کوئی معاملہ پیش آتا تو انہی کے نمائندوں سے اس کے بارے میں مشاورت ہوتی. قاعدہ تھا کہ جو شخص اپاہج اور ضعیف ہو جاتا اور محنت و مزدوری سے کسبِ معاش نہ کر سکتا تو اس کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر ہو جاتا. مساوات کی یہ انتہا کہ اس میں مسلمانوں کے ساتھ ذمی بھی برابر کے شریک تھے. چنانچہ ابنِ ولید نے حیرہ کے ذمیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) اس میں یہ شرط بھی داخل تھی. خلافتِ راشدہ کے بعد اگرچہ حکومت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی. بایں ہمہ عہدِ بنی اُمیہ اور عہدِ عباسیہ میں بھی ہمیں مذہبی رواداری کے درخشندہ واقعات صاف صاف نظر آتے ہیں. خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گرجا کوئی صومعہ گرایا نہ جائے[1].

عہدِ عباسیہ میں

خلیفہ ہشام کے لڑکے نے ایک مرتبہ شکایت کی کہ ایک مسلمان کو ایک عیسائی نے مارا ہے. خلیفہ نے کہا کہ اس سے کہو کہ عدالت میں جا کر چارہ جوئی کرے. مسلمان اور عیسائی کی تمیز کیسی[2]؟

خلیفہ المامون کے وقت میں ایک پادری 'یزداں بخت' دربار میں آیا. مسلمانوں سے اس نے مباحثہ کیا اور ہار گیا. خلیفہ نے کہا 'اب مسلمان ہو جاؤ'. اس نے کہا زبردستی یا اپنی مرضی سے. خلیفہ نے کہا 'اپنی مرضی سے' اس میں زبردستی کوئی نہیں. اس نے کہا پھر تو میں مسلمان نہیں ہوتا. چنانچہ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے فوجی حفاظت میں اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، مبادا کوئی نادان اسے نقصان پہنچا دے[3]. عہدِ عباسیہ میں نسطورین فرقہ کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کا تنازعہ ہو گیا. ایک مسلمان مارا گیا. جس سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے ان کے گرجے پر حملہ کر دیا. گرجے کو اتفاقیہ آگ لگ گئی. عیسائیوں نے مسلمان قاضی کی عدالت میں دعویٰ

---

[1] و [2] (THE CALIPHATE......... MUIR)

[3] (PREACHING OF ISLAM)

دائر کر دیا۔ چنانچہ ابو حامد اسفرائنی اور ابو بکر خوارزمی جیسے جلیل القدر مقننین کی رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ جس شخص نے گرجے پر حملہ کرنے میں مسابقت کی ہے، وہ مجرم ہے۔ اُسے اُس کے جرم کی سزا دی جائے[۱]۔ ان واقعات سے اس زمانہ کی عام مذہبی آزادی کا پتہ چل سکتا ہے۔

مصر میں

مصر میں سلطان صلاح الدین کے وقت میں عیسائی اچھے اچھے عہدوں پر متمکن تھے۔ سیکرٹری، اکونٹنٹ، رجسٹرار بالعموم عیسائی ہوتے تھے[۲]۔ مسٹر لارنس ای براؤن نے لکھا ہے کہ مصر میں عیسائیوں پر سوائے خلیفہ الحاکم کے عہد کے، جو درحقیقت دیوانہ قرار دیا جاتا تھا، کبھی ظلم و ستم نہ ہوا، اور جہاں کہیں عیسائیوں نے کچھ مصیبتیں اٹھائیں وہ ان کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تھیں[۳]۔ جنگِ صلیبی کے وقت بہت سے عیسائی مسلمانوں کے کیمپ میں پناہ گزیں ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کو امان دی۔ ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور بہت سے وہیں ملازم ہو گئے اور اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم رہے اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا۔ انہی حالات کی روشنی میں سر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ:۔

صلیبی لڑائیاں

"اگر خلفائے عباسیہ چاہتے، تو جس طرح ازبلا اور فرڈی ننڈ نے سپانیہ سے اسلام کو خارج کر دیا تھا، یا لوئس چہاردہم نے فرانس میں پراٹسٹنٹ کے عیسائی فرقہ کو مجرم قرار دے دیا تھا، وہ بھی ایشیائے کوچک سے عیسائی خارج کر دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا[۴]۔"

اِنہیں صلیبی لڑائیوں کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ایک سرہنگ، فرنگی فوج سے ایک شیر خوار بچہ اٹھا لایا۔ اس کی ماں رنج و غم سے بے قرار ہو گئی۔ اور اپنے سرداروں کے پاس جا کر روئی۔ انہوں نے کہا کہ سلطان صلاح الدین ایک سچا مسلمان ہے۔ اس کی خدمت میں جا کر عرض کرو۔ وہ روتی ہوئی آئی اور اپنی داستان سنائی۔ سلطان یہ کہانی سُنتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو سلطان غصہ سے کانپ رہا تھا۔ خود اٹھا، ساری فوج میں تلاش کیا، معلوم ہوا کہ بچہ بیچ دیا گیا ہے۔ اس کے دام ادا کر کے بچہ کو واپس منگایا اور اس کی ماں کی گود میں دے دیا اور سوار کرا کے عزت کے ساتھ واپس پہنچا دیا۔

۱؎ (ECLIPS OF CHRISTIANITY)

۲؎ و ۳؎، ۴؎ (ECLIPS OF CHRISTIANITY)

جس زمانہ میں سلطان، رملہ کے متصل خیمہ زن تھا، یافا میں انگلستانی بادشاہ رچرڈ بیمار پڑا۔ رچرڈ کے پاس اس وقت صرف دو تین سو سپاہی تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ بیمار دشمن پر حملہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ رچرڈ کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ سلطان اسے روزانہ برف اور میوہ بھیجتا تھا اور بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان خود طبیب بن کر اُسے دیکھنے گیا اور اس کا علاج بھی کیا۔

جب فرنگی بیت المقدس میں سلطان کے محاصرہ سے تنگ آگئے تو امان کے طالب ہوئے۔ اُس نے امان دے دی اور کہا کہ تمام فرنگی چالیس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں۔ جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی تو سپاہیوں نے دیکھا کہ فرنگی اشرفیوں کے صندوق بھرے لئے جا رہے ہیں۔ سلطان سے جا کر کہا گیا کہ فاتح فوج ایسی غنیمت سے کیوں محروم کی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ درست ہے لیکن بدعہدی ہمارا شیوہ نہیں۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیاد کی قیادت میں، جو کیتھولک تھا، میدانِ قوصوہ میں صف آرا تھا، اس وقت ہونیاد کے ساتھی سلطان سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تمہیں فتح حاصل ہو گئی تو کیا کرو گے۔ اس نے کہا سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا۔ لیکن جب یہی سوال شاہ سربیا نے مراد کے پاس بھیجا تو اسنے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک کنیسہ بنانے کی اجازت دے دوں گا تاکہ جس کا جی چاہے مسجد میں آئے جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ سربیا نے ہونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے صلیبیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

ایک بار ایک عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے۔ مفتی نے جواب دیا کہ بے شک۔ دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگرچہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم وقیع نہیں لیکن عہدِ اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر، یک طرفہ میلان و رجحان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اس

دشمن کی شہادت

زمانہ کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دستیاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا واقعی مسلمانوں کے عہد حکومت سے مطمئن اور خوش تھی۔ ورنہ ظاہر ہے اگر انہیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا چڑھا کر لکھتے۔ ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بطریق ایشوب سوئم (یوار دشیر (فارس) کے سامین کے نام ایک خط کے دوران لکھتا ہے:۔

یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے، آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے پاس رہتے ہیں. لیکن انہوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا. بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب کی عزت کرتے ہیں. ہمارے پادریوں اور خدائے مسیحی کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں اور کلیساؤں اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف واکرام کا سلوک کیا جاتا ہے۔[۱]

چونکہ اس بطریق کا زمانہ قریباً ۶۴۷ء تا غایت ۶۶۰ء ہے اس لئے مصرحہ بالا خط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے عہدِ حکومت میں لکھا گیا ہوگا. یروشلم کے فرقۂ مالکی کا ایک بطریق قسطنطنیہ کے بطریق کے نام ایک خط میں رقمطراز ہے:۔

"مسلمان عادل ہیں اور ہم سے نہ کوئی بے انصافی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی زیادتی روا رکھتے ہیں۔[۲]"

اسی طرح نزبن کے میٹروپولیٹین الیاس نے ۱۰۰۸-۹ء میں لکھا ہے:۔

"مسلمانوں کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی اطاعت اور محبت دیگر مذاہب کے لوگوں کی اطاعت سے زیادہ ہم کو متأثر کرتی ہے خواہ ہم ان کی رعایا ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ وہ ہم سے کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں. اور یہ اس لئے کہ مسلمان اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ ہماری حفاظت کریں اور ہم سے نیک سلوک کریں. اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے جو کوئی غیر مذہب والے کو ستائے گا، نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اس مسلمان سے مواخذہ کریں گے۔[۳] ان کا قانون ہمارے حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور ہمیں دیگر مذاہب سے متمیز قرار دیتا ہے. یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مسلمان نے جب ہم سے زیادتی کی ہے تو اس کے قانون نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے یہ ناجائز کام کیا ہے. برعکس اس کے، دوسرے مذاہب کے تبعین

---

[۱] (THE ECLIPS OF CHRISTIANITY)

[۲] (BOEHIER)

[۳] یہ ابوداؤد کی ایک حدیث کی بناء پر ہے۔ (برتویز)

میں سے کسی نے اگر ہماری عزت کی ہے یا ہم سے نیک سلوک کیا ہے تو اسے اس کے قانون نے بتایا ہے کہ اس نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ لہذا مسلمانوں نے اگر کہیں ہم پر زیادتی بھی کی ہے تو ان کے اس اعتراف کی بنا پر کہ انہوں نے یہ مستحسن کام نہیں کیا' ان کی زیادتی ہمارے لئے دیگر اہلِ مذاہب کے حسنِ سلوک سے کہیں بہتر ہے کہ جس سلوک کی بنا پر ان کے قانون نے انہیں بتایا کہ انہوں نے یہ بُرا کام کیا ہے[1]۔"

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ غیر مسلم رعایا مسلمانوں کے عہدِ حکومت اور ان کے اصولوں کو کس قدر نعمتِ الٰہی سمجھتی تھی' اور ان کو کس قدر اطمینان اور آزادی حاصل تھی۔ برعکس اس کے' اس زمانہ میں جہاں کہیں مسلمان عیسائی حکومت میں آباد تھے' ان پر انتہائی مظالم توڑے جاتے تھے۔ ابی سینیا میں شاہ سیفا آزاد نے حکمِ عام دے رکھا تھا کہ ملک میں جتنے مسلمان ہیں' یا تو عیسائی ہو جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں' یا جہاں ہوں وہیں قتل کر دیئے جائیں[2]۔ حالانکہ یہ وہ ابی سینیا ہے جو مسلمانوں کی وسعتِ ظرف کے صدقے میں عیسائیوں کے قبضے میں رہا تھا۔

نجاشی کی مملکت

نجاشی نے مسلمانوں کے سب سے پہلے مہاجرین کے قافلہ کو سات آٹھ سال تک اپنے ہاں پناہ دی تو مسلمانوں نے اس احسان کا بدلہ اس انداز سے دیا کہ سات آٹھ سو سال تک' جبکہ چین سے لے کر مراکش تک اسلامی پرچم لہراتا رہا' حبش کی عیسائی سلطنت میں' جو ایک مختصر سے قطعۂ ارض پر مشتمل تھی' کبھی دخل انداز نہ ہوئے۔ درآں حالیکہ نجاشیِ اوّل کا جانشین ہی مسلمانوں کا مخالف ہو گیا تھا۔ اور ۹ھ میں ایک دستہ فوج لے کر جدّہ تک چڑھ آیا تھا۔ نبیِ اکرمؐ نے بجائے جنگ کرنے کے اس سے صلح کا برتاؤ کیا اور نجاشی کے احسان کے بدلے میں مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ

سالموا الحبشہ ما سالمتکم

جب تک اہلِ حبش تم سے مصالحت رکھیں تم بھی ان سے مصالحت رکھنا۔

یہ تو تھا مسلمانوں کا طرزِ عمل حبش کے عیسائیوں کے ساتھ' لیکن اسی حبش کا خود اٹلی کے عیسائیوں کے ہاتھوں کیا انجام ہوا' دنیا اس پر شاہد ہے۔

---

[1] (THE ECLIPS OF CHRISTIANITY)

[2] (PREACHING OF ISLAM)

اسپین میں جب مسلمان اسپین میں داخل ہوئے تو وہاں کی عیسائی سلطنت کے ماتحت یہودیوں پر ایک قیامت برپا تھی۔ انہوں نے یہودیوں کو ان کے پنجہ استبداد سے چھڑایا اور خود عیسائیوں کو ان کے مذہب میں کامل آزادی عطا کی۔ وہ اپنے معاملات کا تصفیہ اپنے قاضیوں سے کراتے، ہر قسم کے مذہبی تہوار مناتے، نئے گرجے بھی تعمیر کرتے۔ آخری زمانے میں عیسائی مذہبی جوش میں قرطبہ کے بازاروں میں آکر رسولِ اکرمؐ کی شان میں گستاخی برتتے لیکن اسلامی حکومت کی طرف سے سزا صرف انفرادی مجرم کو دی جاتی۔ اس کے ہم مذہب دیگر افراد سے کوئی باز پرس نہ ہوتی' اور تمام عیسائی رعایا امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتی[۱] ایک روسی مؤرخ کا بیان ہے کہ

> فتح قسطنطنیہ کے وقت عیسائیوں کے مظالم سے غریبوں پر خدا کی دنیا تنگ ہو چکی تھی۔ مسلمان ان کے خرمنِ استبداد پر برقِ خاطف بن کر گرے۔ ان کے منصف اپنی امانتوں میں کبھی خیانت نہیں کرتے تھے۔[۲]

فارس میں فارس میں آتش پرستوں کے معبد بالکل محفوظ رہے۔ دسویں صدی یعنی فتح ایران کے تین سو سال بعد تک کے مؤرخین کے بیان کے مطابق عراق' فارس' کرمان' خراسان' آذربائیجان میں آتشکدے موجود تھے۔ المعتصم کے عہد میں ایک جرنیل نے ایک امام مسجد اور مؤذن کو دُرّوں سے پیٹا، جن کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک پرانے آتشکدے کو مسجد میں تبدیل کرانا چاہتے تھے۔ شیراز میں گیارھویں اور تیرھویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کئے جاتے۔ یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے تھے۔[۳]

منگول اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا تحیّر انگیز اثر ہے کہ وہ انسان میں قلبِ ماہیت کر دیتی ہے۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخ عالم میں وحشت و بربریت کے مجسمے تصور کئے جاتے ہیں۔ ہر زبان میں ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی

۱۔ (ARNOLD'S)

۲۔ (KARAMSIN-VOL.V-P.45)

۳۔ (THE CALIPHS AND THEIR NON-MUSLIM SUBJECTS-

تعصب وجنون کا اندازہ لگا لیجئے. چنگیز خان اور بغراخان کے عہدِ حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کردے. لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خان نے پیٹر کے اسقف کے نام ۱۳۱۲ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدودِ سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجا کو نقصان نہیں پہنچائے گا اس کی جائیداد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعاً تعرض نہیں کرے گا. جو ایسا کرے گا وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہوگا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ[1]

ہندوستان میں

ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا تحصیلِ لاحاصل ہے. یہاں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مذہبی رواداری کا ثبوت خود یہاں کی مردم شماری ہے. ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا. لیکن بایں ہمہ 'سلطنتِ مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی[2]. اور جب تلوار ہاتھ سے نکل گئی تو اس اسّی سال کے عرصہ میں وہ تین گُنا ہو گئی. ان اعداد و شمار سے اگر وہ تعداد خارج کر دی جائے جو غیر ہندی مسلمانوں اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ہندوستان میں کس قدر اسلامی مبلغ آئے اور انہوں نے غیر مسلم باشندوں کے دلوں میں کس قدر گہری عقیدت پیدا کر لی، تو شمشیر بچاری کے حصہ میں سوائے بدنامی کے اور کیا رہ جاتا ہے؟

سندھ میں

سب سے پہلے حجاج کے عہد میں غازی محمدؒ بن قاسم کے زیرِ قیادت مسلمان سندھ میں آئے. سر ولیم میور لکھتا ہے کہ "اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمام مندر اسی طرح

---

[1] ARNOLD)

[2] ڈاکٹر ہینٹ کے ایک بیان کی رُو سے جب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تو مسلمان کُل آبادی کا دسواں حصہ تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی مردم شماری کی رپورٹ بابت ۱۸۸۱ء کے مطابق مسلمان کل آبادی کا پانچواں حصہ یعنی پانچ کروڑ تھے. لیکن ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۸ کروڑ.

رہنے دیئے ان کو بُت پرستی سے بہ جبر نہیں روکا۔ یہود، نصاریٰ، پارسی سب کو اجازت تھی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اسلامی حکومت کے ہندوستان غیر مسلم ہی رہا[1]۔ محمود غزنوی کے حملے مسلم جور و استبداد کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کئے جاتے ہیں لیکن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا عیسائی مدیر ان تمام حملوں کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ:۔

محمود غزنوی

محمود نے مذہب کے بارے میں کہیں زبردستی نہیں کی بلکہ کئی جگہ اس نے اپنے اہلِ مذہب پر ہندوؤں کو ترجیح دی۔

اسی طرح لالہ تلسی رام صاحب اپنی کتاب "واقعاتِ ہند" میں لکھتے ہیں:۔

محمود نے بہ جبر کسی کو مسلمان نہیں بنایا۔ نہ کسی ہندو کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ہندو ہے۔

ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:۔

مسلمانوں کی تدبیر مملکت کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہب میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کے مذہبی رسوم کو بجالانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں۔

اکبر کے عہد میں یہ رواداری تو گویا جانب داری کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ راجہ مان سنگھ کو مثلاً وہ اقتدار حاصل تھا جو شاید پرتھوی راج کو بھی نصیب نہ ہوا ہو۔ راجہ ٹودرمل وغیرہ کی قدر و منزلت کسی صورت میں بکرماجیت

اکبر کے عہد میں

کے نورتنوں سے کم نہ تھی۔ مذہبی آزادیوں کے متعلق رائے بہادر لال بیج ناتھ اپنی کتاب "ہندوستان گذشتہ وحال" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

مسلمان فرمانرواؤں کی نسبت یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں مندر بننے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ دہلی، آگرہ، متھرا وغیرہ میں جو اسلامی قوت و سطوت کے خاص مرکز تھے، بہت سے مندر شاہانِ اسلام کے عہد کے تعمیر شدہ اس وقت تک موجود ہیں۔

اورنگ زیب

اورنگ زیب کے تو نام ہی سے ایک خونچکاں منظر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب تک سوا من زنار نہیں اُتروا لیتا تھا کھانا نہیں کھایا کرتا تھا[2]۔ لیکن

---

[1] (THE CALIPHATE............ P. 365)

[2] اگر ایک زنار کے تاگہ کا وزن ایک تولہ بھی فرض کر لیا جائے تو اس حساب سے ...۔ہم ہندو ہر روز مسلمان کئے جاتے تھے یا قتل کرا دیئے (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

تاریخ کے ان صفحات کو کہاں لیجایئے جن پر ثبت ہے کہ

اورنگ زیب کو خبر پہنچی کہ بنارس کے بعض حکام برہمنوں کو ستاتے ہیں. تو اس نے ابوالحسن گورنر بنارس کو فرمان بھیجا کہ ہماری شریعت کا حکم ہے کہ مندر نہ ڈھائے جائیں اور ان کے پجاریوں پر سختی نہ کی جائے. لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی برہمن یا ہندو پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالے[1].

اسی طرح بابو رام نرائن صاحب، مینیجر ریاست رام نگر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں،۔

ضلع سیتاپور میں مصرکہ کے مندر کو عالمگیر نے چند مواضعات جاگیر میں دیئے جواب تک موجود ہیں. نیز متھرا کے نزدیک بلدیو راؤ کے مندر کو بہت سے گاؤں جاگیر میں دیئے.

بابو منوہر لال صاحب ادھری اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:۔

اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیریں دیں. اس کے بڑے بڑے عہدے دار ہندو تھے.

پروفیسر ایشوری پرشاد صاحب اپنی "تاریخ ہند" میں لکھتے ہیں:۔

ملتان میں توتلہ مائی کے مندر کو ایک سو روپیہ سالانہ جاگیر عالمگیر نے عطا فرمائی. ڈیرہ دون کے گوردوارہ کو جاگیر دی. ہندوؤں پر سے محصول جاترہ جو پہلے سے چلا آتا تھا موقوف کردیا.

سکھوں کے ہاں تو "اورنگا" کے مظالم کی داستانیں ہر تقریب پر دہرائی جاتی ہیں اور ان میں گورو گوبند سنگھ کے واقعات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے. لیکن رائے بہادر کنھیا لال اپنی "تاریخ پنجاب" میں لکھتے ہیں،۔

گورو گوبند سنگھ جی نے محاصرہ کے بعد اورنگ زیب کو فارسی میں عرضی لکھی کہ میں سیاست سے الگ ہو کر عبادت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں. بادشاہ نے لکھا کہ اگر ایسا ہے تو آپ سے کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی. چنانچہ اس نے تمام حکام کو اس کے مطابق احکام جاری کردیئے.

ٹیپو سلطان متاخرین میں سے حیدر علی اور سلطان ٹیپو بھی اس بارے میں بہت بدنام کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے ہندو خاندانوں کو مسلمان کرلیا تھا. ان کے متعلق سر تھامس آرنلڈ لکھتے ہیں کہ،۔

(گذشتہ صفحے کا بقیہ فٹ نوٹ) جاتے تھے. اب اندازہ فرمایئے کہ اورنگ زیب کے پچاس سالہ عہدِ حکومت میں کس قدر ہندو مسلمان ہوئے یا قتل کئے گئے.

[1] "بنارس سٹی" مصنفہ نرنجن سین صاحب، بی. اے. ایل. ایل. بی. وکیل.

اسی حیدر علی کے دو وزیر برہمن تھے اور شاما برہمن اس کا معتمدِ خاص تھا۔ ملوکوٹہ میں جو وشنو کا مندر ہے اس میں دو چاندی کے برتن ہیں جن پر یہ عبارت کندہ ہے۔ "یہ برتن ٹیپو سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ، مندر کو دیئے گئے۔"

O

ان واقعات کو دہرانے سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ان مسلمان فرمانرواؤں کی وسعتِ نظر اور کشادہ دلی کے قصائد لکھے جائیں۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ان کے عہدِ حکومت میں اسلامی کلچر، اسلامی روایات، اور اسلامی تعلیم کے کچھ نہ کچھ آثار باقی تھے اس لئے ان کا تقاضا تھا کہ غیر مذاہب والوں سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ جب عام مسلمانوں کی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کی مذہبی رواداری کا عملی ثبوت دیا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ جب دنیا میں صحیح معنوں میں قرآنی نظام قائم ہو جائے تو اس وقت تمام نوعِ انسانی کو کس قدر آزادیٔ مذہب اور حریتِ فکر حاصل ہوگی۔ اگر غیر مسلم ان واقعات پر غور و فکر کریں تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ اسلام کا دامن ان تمام خونی دھبوں سے پاک ہے جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دینے والا ہے اور کسی حالت میں بھی رشتۂ عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ اس کے خدا کا اعلان یہ ہے کہ:۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ برتو۔ عدل کرو کہ وہ تقوٰے سے بہت قریب ہے۔

اور انہی واقعات کو دیکھنے کے بعد ایک عیسائی مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:۔

تاریخ کے واقعات جو ہم نے اس کتاب کے صفحات پر بے نقاب کئے ہیں، ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام ایشیا کے عیسائیوں سے "بزورِ شمشیر" نہیں منوایا گیا، بلکہ اس کی اشاعت مسلمانوں کی روز افزوں ترقیوں کی وجہ سے ہوئی ہے[2]

---

[1] سوانح عمری حیدر علی، از ڈپٹی لال نگم۔

[2] (THE ECLIPS OF CHRISTIANITY IN ASIA P.P. 183-184 8:143)

برعکس اس کے۔

صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں کے دل میں سب سے پہلے آرزو یہ تھی کہ وہ جناب مسیحؑ کے لئے
”بزورِ شمشیر“ ایک سلطنت حاصل کرلیں۔[1]

(THE ECLIPS OF CHRISTIANITY IN ASIA)

تمسّک بالکتاب

(نوشتہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)

بلا کی کالی رات تھی۔ سامنے پہاڑ کی بٹیا سے دو آدمی نیچے اُتر رہے تھے۔ ایک کے پاس روشنی تھی اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے شخص کو راستہ دکھانے کی غرض سے ساتھ ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا" بھائی! روشنی میرے آگے آگے رکھو تا کہ راستہ روشن ہو۔ پیچھے رکھنے سے تو اُلٹا خود میرے سایہ سے راستہ تاریک تر ہوتا چلا جا رہا ہے"۔ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ پھر وہی تاریکی اور وہی سناٹا تھا۔ لیکن اس جانے والے کا فقرہ ابھی تک میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ وہ تاریکیوں کے پردے کو چاک کرتی چلی جائے۔ لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ روشنی کو اس کے صحیح محل پر رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا میں اس قوم کو بھیجا جس کے متعلق خود فرما دیا۔

آسمانی روشنی

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰)

تم بہترین قوم ہو جو نوعِ انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

تو انہیں ہلاکت اور تباہی کے عمیق غاروں سے بچانے کے لئے ایک مشعلِ ہدایت ایک سراجِ منیر ایک نورِ مبین عطا فرمایا کہ وہ اس کو اپنے جادۂ حیات میں پیش پیش رکھیں۔ اپنے شاہراہِ عمل کا خضرِ طریقت بنائیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں جو قدم اٹھائیں اس کی روشنی میں اٹھائیں تاکہ وہ راستہ کی پُرخطر و مہیب گھاٹیوں سے مامون و مصئون منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ
رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ

يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (۱۵-۱۶/۵)

اور تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور یعنی ایک کتابِ مبین آئی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ ایسے لوگوں کو جو قانونِ خداوندی کا اتباع کریں سلامتی کی راہ بتاتا اور انہیں اس قانون کی رُو سے ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

لیکن اگر وہ اس روشنی کو بجائے سامنے رکھنے کے (جس سے ان کا راستہ روشن ہو جائے) اپنے پیچھے رکھ چھوڑیں تو ظاہر ہے کہ قطع شدہ منزل تو ضرور درخشندہ و تابناک نظر آئے گی لیکن سامنے کا راستہ پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہو جائے گا اس لئے کہ تنہا عقل کی دھندلی سی روشنی میں عام طور پر جس قدر راستہ نظر آسکتا ہے اس طرح وہ بھی ان کے اپنے سائے سے ظلمت ناک ہو جائے گا۔ یہی مطلب اس آیتِ مقدسہ کا ہے جس میں یہودیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو پیٹھ کے پیچھے رکھ چھوڑا تھا تاکہ ان کا ماضی درخشندہ رہے لیکن مستقبل خوفناک طور پر تاریک ہو جائے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(۲/۱۰۱)

اور جب ان کے پاس من جانب اللہ وہ رسول آیا جو سچ کر کے دکھاتا ہے اُسے جو اُن کے پاس ہے تو اہلِ کتاب کے ایک فریق نے خود کتاب اللہ ہی کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا گویا انہیں کچھ علم ہی نہیں۔

یہود کا جُرم

یہود کا کیا جرم تھا؟ یہی کہ جب اُن سے کہا گیا کہ آؤ اس مقدس روشنی کو اپنا نصب العینِ حیات بناؤ جس سے تمہارا حال و مستقبل روشن ہو جائے اور تمہیں نظر آجائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے' اور تمہاری کورانہ تقلید نے تمہیں کس راستے پر ڈال رکھا ہے' تو انہوں نے اس روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جس ڈگر پر ہمارے آباء واجداد چلتے آئے ہیں' وہی صراطِ مستقیم ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۗ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○ (۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے

ہوں نہ ہدایت۔

یہی چیز ہے جسے اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفر سے تعبیر کیا ہے ؛

جو شخص کفر کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو ایسے (جانور) کے پیچھے چلا جا رہا ہو جو بجز بُلانے اور پکارنے کے اور کسی بات کو نہیں سمجھ سکتا (اسی طرح یہ لوگ بھی) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ (۲/۱۷۱)

کفر وناسپاسی اسی روش کا نام ہے کہ جو چیز جس مصرف کے لئے دی گئی ہے اسے اس مصرف میں نہ لایا جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال کا صحیح مقصد یہ ہے کہ اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کیا جائے۔ لیکن جو لوگ اس کے برعکس اسے دبائے رکھتے ہیں انہیں قرآن کریم نے کفار قرار دیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ (۴/۳۷)

یعنی وہ لوگ جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخیلی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دے دی ہے۔ اور ہم نے ایسے کفار کے لئے ذلت آمیز عذاب مقرر کر رکھا ہے۔

لہٰذا اپنی زندگی میں قرآن کریم کو اس کی صحیح جگہ پر نہ رکھنا یعنی ہر معاملہ میں خالی الذہن ہو کر اس کی روشنی میں قدم نہ اٹھانا قرآن کی نظر میں کفر ہے ایمان نہیں۔

کتاب اللہ کو پسِ پُشت ڈال دینا

اب سوال یہ ہے کہ کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال دینے سے مطلب کیا ہے۔ آپ کو کوئی مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے قرآنِ کریم کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے یا اس کا قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن صرف اسی قدر اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک ایمان و ایقان کی صداقت کا ثبوت یہی ہے کہ انسان کے اعمال اس اعتراف کی شہادت دیتے ہوں۔ مثلاً دیکھئے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر تم خلافِ ارشادِ خداوندی 'ربوٰ' میں اُلجھ گئے تو تمہارے لئے وہی جہنم ہے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (۱۲۹-۱۳۰/۳)

اے ایمان والو! ربوٰ مت کھاؤ۔ دونا۔ دُگنا کئے ہوئے۔ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اور اس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

عام طور پر آپ کو دو قسم کی جماعتیں ملیں گی۔ ایک وہ لوگ جو دنیا میں صحیح اور غلط، کا معیار اپنی مفاد پرستیوں ہی کو سمجھتے ہیں۔ ہر معاملہ کا اپنی مصلحت کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور انہی فیصلوں کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ اپنی عقل کا بے محل استعمال کرتے ہیں اس لئے انہیں ظالم کہا گیا اور ان کے متعلق ارشاد ہوا۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ؀ (۳۰/۲۹)

لیکن ان ظالموں نے بلا علم و دلیل اپنی خواہشات (خیالات) کا اتباع کر رکھا ہے۔ سوچو (خدا کے قانون کے مطابق یوں) گمراہ ہو جائے اُسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ ان کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

چونکہ تنہا عقل کے فیصلے یقینیات پر مبنی نہیں ہوتے[1] اس لئے قرآنِ کریم نے یقینی اور حقیقی علم، علم الکتاب کو کہا ہے، اور جو علم الکتاب نہیں رکھتا، اس کے متعلق کہا کہ وہ محض قیاس آرائیاں کرتا ہے۔ وہ ذہنِ انسانی کی ابلہ فریبیوں سے طرح طرح کی منطقی موشگافیوں اور قسم قسم کی فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کے حلقۂ دامِ فریب میں اُلجھا رہتا ہے اور عروسِ حقیقت اس کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہوتی۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ؀

(۲/۷۸)

اور ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو کتاب کا علم تو کچھ نہیں رکھتے سوائے اس کی لفظی تلاوت کے۔ یہ لوگ محض قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

---

[1] تنہا عقل، انسانی رہنمائی کے لئے کیوں ناکافی اور ناقابلِ اعتبار ہے اس کی تفصیل اس موضوع سے خارج ہے اور ایک مستقل عنوان کی محتاج۔ اس وقت اس باب میں جوڈ کے بیان کا مختصر سا اقتباس پیش کرنا کافی ہوگا۔ لکھتا ہے "عقل فی الحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی یا انہیں بروئے کار لانے کا ایک آلہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ان مقاصد کو ہمارے لئے مہیا کر دے۔ جنہیں ہمارا نفس ہمارے لئے تجویز کر رہا ہے۔ اور اس انداز سے کہ جو ہمارا نفس غیر شعوری طور پر کرنا چاہے اس کے جواز میں دلائل وحیل تراش دے"۔ تفصیل ان امور کی "ابلیس و آدم" اور "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی۔

لیکن ظن حقیقت کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝ (۱۰/۳۶)

اور ان میں سے اکثر محض ظن کا اتباع کرتے ہیں۔ اور یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا اور اللہ ان کے اعمال سے واقف ہے۔

دو قسم کی جماعتیں

یہ جماعت کبھی سعادت کی راہ نہیں پا سکتی کیونکہ انہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے جس نے قرآن کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ اور یہ جماعت اس پہلی جماعت سے بھی زیادہ خطرناک وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ بقدم الذکر جماعت کی خطا و لغزش کا راز ان کے کیریکٹر کی کمزوری ہے۔ قوتِ ایمان کا فقدان ہے۔ وہ رجحاناتِ ذہنی اور خواہشاتِ قلبی کے غلام ہیں۔ لیکن بایں ہمہ، ان میں سے جو سلیم الطبع ہیں، جب اُن کے سامنے قرآنِ کریم کا کھلا کھلا فیصلہ آجائے تو ان کی نگاہیں ضرور جھک جائیں گی۔ قلب محسوس کرے گا، اور انہیں نظر آجائے گا کہ جس راہِ عمل کو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ ان کی قلبی کمزوریوں کی وجہ سے ہے۔ قرآن کا راستہ وہ نہیں اور چونکہ ان میں عقل و بصیرت موجود ہوتی ہے، اس لئے جب ایک مرتبہ ان کے سامنے رشد و ہدایت کی راہیں کھل جائیں تو وہ اپنی روش کو دین بنا کر پیش نہیں کرتے، اس کے برعکس دوسرے لوگ وہ ہیں جو غلط راستے پر چل رہے ہیں لیکن اسے عین صراطِ مستقیم سمجھ رہے ہیں۔ غلط مسلمات، غلط معتقدات، غلط نظریئے ذہن میں جما رکھے ہیں اور انہیں دین کا نچوڑ قرار دیتے ہیں۔ وہ نمازوں میں اپنا رُخ قبلہ نما کو دیکھ کر سیدھا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے قبلہ نما کا رُخ ہی کسی اور سمت کو ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا اور رسولؐ کا متبع جانتے ہیں لیکن ان کا اتباع اپنے جیسے انسانوں کا اتباع ہوتا ہے، دینِ خداوندی کا اتباع نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں۔

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ (۱۸/۱۰۴)

جن کی کوششیں اس دنیا میں غلط راستے پر پڑی ہوئی ہیں اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

ان میں عوام کو تو چھوڑیئے، جن میں ہنوز سمجھنے کی استعداد ہی نہیں ـــ اگرچہ کسی قوم میں جہالت کا ہونا کوئی

معقول عذر یا فخر کی بات نہیں. لیکن قیامت تو یہ ہے کہ جو لوگ عوام کے راہ نما، علم و فضل کے مدعی' رشد و ہدایت کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں. ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ان کے علم و عمل کو قرآن سے کچھ نسبت نہیں ہوتی (الّا ماشاءاللہ)

دوسری قسم کے لوگ

اس جماعت کا علاج اوّل الذکر جماعت سے کہیں دشوار تر اور کہیں دقّت طلب ہے. اگر اوّل الذکر جماعت کو ان کے غلط راستے سے ہٹا کر سیدھی راہ پر لانا ہو تو ان میں صرف قوّتِ عمل کا بیدار کرنا ضروری ہوگا. اس کے بعد وہ محسوس کریں گے انہیں مرض کے بدلے شفا مل رہی ہے' ضعف کے عوض قوّت اور اضطراب کی جگہ تسکین حاصل ہو رہی ہے. لیکن اگر اس (دوسری) جماعت کے مروجہ دساتیر و آئین سے انہیں ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹنے کی دعوت دی جائے وہ تڑپ اُٹھیں گے کہ ان کے معتقدات ان سے چھن رہے ہیں. اور معتقدات (غلط ہوں یا صحیح) قلبِ انسانی کے لئے گراں بہا متاع ہوتے ہیں. اور وہ اسے یوں لُٹتے نہیں دیکھ سکتا. اور معتقدات بھی ایسے جو نسلاً بعد نسلٍ آباء و اجداد سے ترکہ میں متوارث چلے آرہے ہوں. ان کے ہاں نہ صرف معتقدات ضائع ہونے ہی کا صدمہ ہوتا ہے بلکہ آباء و اجداد کی تعظیم و تقدیس لُٹ جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے. جب یہود نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے طریقوں پر ہی چلیں گے تو آباء و اجداد سے مراد نسبی آباء نہیں تھے بلکہ ان کے متقدمین' احبار و رہبان تھے. اس لئے کہ جب قرآنِ کریم میں یہ آیت نازل ہوئی کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدا بنا رکھا ہے. تو نبیِ اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ وہ انہیں خدا بنا کر پوجتے تو نہیں. اس پر آپؐ نے فرمایا کہ وہ اس چیز کو حلال سمجھتے ہیں جسے ان کے علماء حلال کہہ دیتے ہیں اور اس کو حرام جسے وہ حرام قرار دیتے ہیں.

تقلیدِ اسلاف

ظاہر ہے کہ جس طریق پر یہ لوگ چل رہے تھے وہ یہی شریعت اور قوانین تھے. اور یہ صرف یہود و نصاریٰ تک ہی محدود نہیں. قرآنِ کریم نے اممِ سابقہ میں سے ہر اُمت کے متعلق فرمایا.

> اور آپ سے قبل کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا جس سے وہاں کے راحت پسند لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریق پر پایا اور ہم انھیں کے نشانات کی اقتدا کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں. اس پر رسول نے کہا کہ خواہ میں اس سے جس پر تم نے اپنے آباء کو پایا ہے بہتر مقصود پر لے جانے والا راستہ کیوں نہ لایا ہوں (تم اسی پر چلے جاؤ گے؟) انہوں نے کہا کہ ہم تو اس سے انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو. (۲۳ــ۲۴/۴۳)

آج مسلمانوں کی خود صدر جماعت کی حالت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی بعینہٖ یہی حالت ہو رہی ہے یا

نہیں؛ وہ جن باتوں کو عینِ دین سمجھ رہے ہیں، اُن میں سے ہر بات کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رُک جاتی ہے ضابطہ خداوندی، شریعتِ الٰہی کا کہیں نام نہیں آتا۔ کیا یہی "مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَاءَنَا" نہیں؟ کیا ایک عقیدہ، ایک فیصلہ، ایک قانون محض اس لئے منجر اِلیٰ صراطِ مستقیم اور منزہ عن الخطا قرار پا سکتا ہے کہ اسے اسلاف میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا جائے؟ مسلمان قرآنِ کریم کو خدائے حیّ و قیوم کا ابدی قانون مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جو اس سراجِ منیر کی روشنی میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ کیا انہوں نے کبھی اس کی ضرورت سمجھی ہے کہ جو باتیں اسلاف کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں اُنہیں اس صراطِ مستقیم سے مطابقت دے لی جائے؟ قرآنِ کریم کی تو یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانہ کی ضروریات کے لئے روشنی دیتا جائے۔ لیکن جو باتیں انسان کی پیدا کردہ ہیں وہ تو بہر کیف ماحول سے متاثر اور اپنے اپنے زمانہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انسانی خیالات کا تو یہ عالم ہے کہ ایک مصنف اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف خیالات قائم کرتا اور ان میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے۔ جب ایک مصنف کی مختصر سی زندگی میں اس کے خیالات قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں، تو حیرت ہے کہ اس کے بعد زمانہ خواہ کہاں سے کہاں چلا جائے، اس کے خیالات، وحیِ الٰہی کی طرح، ناقابلِ تغیر کیسے ہو جائیں گے؟ قرآنِ کریم صحیفہ فطرت ہے۔ فطرت کی کسی چیز کو اٹھا کر دیکھئے، وہ کسی خاص زمانہ سے مقید نہ ہوگی۔ یہ کبھی نہ ہوگا کہ اس شئے کے متعلق جو کچھ تجارب و مشاہدات کسی ایک زمانہ میں عمل میں آ چکے ہوں۔ اس کے فوائد و خصائص جو کسی ایک وقت معین کئے جا چکے ہوں، اُن پر مُہر لگ جائے اور آنے والی نسلیں گذشتہ محققین کی تحقیق و تفتیش کو نقشِ آخر سمجھ لیں۔ فطرت کی ہر شئے، ہر زمانہ کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے رہی ہے۔ آج تک کسی شئے نے یہ نہیں کہا کہ بس میں اب تھک چکی۔ اب میں زمانہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن تعجب ہے کہ کتابِ الٰہی کو صحیفہ فطرت ماننے والے اس کے متعلق یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ اس میں سے جو کچھ لیا جانا تھا ازمنہ گذشتہ میں لیا جا چکا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کتابِ مقدس (نعوذ باللہ) ایک بیکار شئے بن چکی ہے۔ قرآنِ کریم کا تو یہ دعوےٰ تھا کہ:۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۝ (۳۸/۸۷-۸۸)

یہ قرآن تمام اہلِ عالم کے لئے یادداشت ہے اور کچھ وقت کے بعد تم اس کے متعلق (خود بخود) جان لو گے۔

لیکن اس کے حاملین کا اب یہ ایمان ہے کہ عالمین سے مراد محض ازمنہ گذشتہ و اقوامِ سابقہ ہیں۔ اب چونکہ بابِ تحقیق بند ہو چکا ہے اس لئے اگر عہدِ حاضر کی قومیں اپنے احوال و ظروف کے مطابق اس سے درسِ عبرت و

موعظت لینا چاہیں اور اپنی ارتقائی منازل میں اسے شمع ہدایت بنانا چاہیں تو جب تک وہ اپنے آپ کو ہزار پانچ سو سال پیچھے نہ لے جائیں اس سے مستفیض نہیں ہو سکتیں. حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جو یہ فرمایا کہ کچھ وقت کے بعد تم اس حقیقت کو جان لو گے کہ قرآن واقعی تمام اقوامِ عالم کے لئے درسِ موعظت ہے، تو جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا حقیقت بے نقاب ہوتی جائے گی. انسان جس قدر ترقی کرتا جائے گا' اس کی عمرانیت اور مدنیت جتنی وسیع ہوتی چلی جائے گی' قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آتا جائے گا کہ اسے کسی خاص زمانہ میں مقید کر دینا اس کی امکانی وسعتوں کو پابہ زنجیر کر دینا ہے. قرآن کا ساری دنیا کو چیلنج ہے کہ آؤ اپنی عقلوں کی حدِ پرواز کو آزماؤ اور دیکھو کہ قرآنِ کریم تم سے کتنا آگے آگے چلتا ہے. لیکن ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ قرآنی کمالات کی جس قدر تکمیل ہونی تھی ہو چکی. اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا.

نفس کی حیلہ جوئی

ماضی پرستی کا یہ جذبہ بظاہر بڑا مقدس' اور یہ عقیدت بڑی مومنانہ نظر آتی ہے کہ یہ اسلاف کی عزت و تکریم اور اپنے عجز و انکسار کی آئینہ دار ہے. لیکن اگر ذرا بہ نظرِ تعمّق دیکھا جائے تو اس کے اندر نفسِ انسانی کی ایک بڑی حیلہ جوئی بھی نظر آئے گی. ظاہر ہے کہ تدبّر و تفکر' تفحص و تجسس کچھ آسان کام نہیں. اس کے لئے بڑی ذہنی کاوش' دماغ سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت ہے. اسلاف میں جن حضرات نے تحقیق و تدقیق کے میدان میں قدم رکھا ان کے سوانح حیات پر نگہ ڈالئے' یکسر مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی نظر آئے گی. برعکس اس کے' بلاسوچے سمجھے ایک پٹڑی پر چلے جانا' بڑی تن آسانی کا کام ہے. قرآنِ کریم نے جن لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ آبا و اجداد کی کورانہ تقلید پر مُصر تھے' ان کے متعلق ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ مترفین تھے یعنی وہ لوگ آسائش و آرام' سہل انگاری اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو چکے تھے. لہٰذا ظاہر ہے کہ جس چیز کو ہمارا نفس عام طور پر عقیدت و عظمت کے خوش آئند لباس میں پیش کرتا ہے. وہ اکثر اوقات اپنی دوں ہمتی اور سہل انگاری کی پردہ پوشی ہوتی ہے' ورنہ ایک مسلم کی زندگی' ذہنی' بدنی اور قلبی ہر حیثیت سے سراپا سعی و عمل کی زندگی ہے' تگ و دو کی زندگی ہے' اضطراب و سیمابیت کی زندگی ہے' یکسر جہاد کی زندگی ہے' عقل و بصیرت اور غور و تفکر کی زندگی ہے. جمود و تعطّل کی زندگی نہیں. اور ان دونوں زندگیوں کو قرآنِ کریم نے برابر قرار نہیں دیا.

اَفَمَنْ يَعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۗ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ (۱۳/۱۹)

کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے حق ہے اس شخص کے
مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو سمجھ دار لوگ ہی قبول کر سکتے ہیں۔

تدبّر و تفکّر دیکھئے! یہاں یہ نہیں کہا کہ "أَفَمَنْ يُؤْمِنُ" یعنی وہ شخص جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جو کچھ نبی اکرم کی طرف سے نازل ہوا ہے حق ہے، بلکہ أَفَمَنْ يَعْلَمُ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ شخص جو علیٰ وجہ البصیرت اس بات کا علم رکھتا ہے۔ اسی لئے آخر میں کہا گیا کہ نصیحت صرف سمجھ دار لوگ قبول کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک ایک قدم پر تدبّر و تفکّر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ:-

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ○ (۸/۲۲)

اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے اور بہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں اور عقل سے
کام نہیں لیتے۔

یوں بھی جو لوگ محض عادتاً یا اس روش کی بنا پر جو اسلاف سے متوارث چلی آرہی ہے "نیک کام" کرتے ہیں انہیں نیک اس لئے سمجھتے ہیں کہ ان کاموں کو ان کے آباء اجداد نیک سمجھتے اور قرار دیتے چلے آئے ہیں' ان سے اُن کی ذات کی نشوو ارتقاء اور ذہنی و قلبی جلا قطعاً نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ خیال کہ بابِ نبوت کی طرح بابِ تدبّر بھی بند ہو چکا ہے کبھی قرآنِ کریم کا منشاء نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم نے تدبّر و تفکّر کا حکم کسی خاص قوم یا خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں رکھا۔ اس لئے اگر یہ سمجھا جائے کہ جس قدر تدبّر و تفکّر قرآن میں ممکن تھا ہو چکا' تو وہ تمام احکام جو قرآن نے تدبّر و تفکّر کے متعلق دیئے ہیں بیکار ہو جائیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم سے تدبّر و تفکّر کی قوت ساقط ہو جائے اس کا کیا حشر ہوا کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے یہ احکام آج بھی اسی طرح قائم العمل ہیں جس طرح اس سے پہلے تھے۔ صرف ہمارے دماغوں پر برف کے تودے جم رہے ہیں اور نہیں غور کرتے کہ قرآن کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ:-

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں میں قفل لگے ہوئے ہیں؟ تو جو لوگ پیٹھ پھیر
کر ہٹ گئے بعد اس کے کہ سیدھا راستہ ان کو معلوم ہو گیا' شیطان نے ان کو چکمہ دیا اور انہیں
مہلت دی گئی ہے۔ (۴۷/۲۵-۲۴)

دوسری جگہ ہے:-

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَمَمَاتُھُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ﴿۴۵/۲۱﴾

یہ لوگ جو برائیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو ان جیسا رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے۔ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا۔ یہ بہت بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

اس آیت پر ذرا گہری نظر ڈالئے۔ قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے کہ کافر و مومن کی زندگی برابر نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کی حالت

لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ مومنین کی زندگی کفّار سے بدرجہا پست و ذلیل ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی کسی مجلس میں جایئے، کسی انجمن کی روئیداد پڑھئے، کسی کانفرنس میں شریک ہو جیئے۔ ہر جگہ ہر وقت یہی مرثیہ خوانی ہو گی کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ان کی رسوائیوں کی حد ہو چکی ہے۔ حالانکہ ذلّت و مسکنت وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا انتہائی غضب قرار دیا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ یہود پر جب ان کے خدا نے اپنا غضب نازل کیا ہے تو انہی الفاظ میں کہ:-

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴿۲/۶۱﴾

پس ان پر ذلّت اور مسکنت کی مار ماری گئی اور وہ غضبِ الٰہی کے مستحق ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس تباہی و بربادی کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں۔ مفکّرینِ قوم سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ اربابِ حل و عقد طرح طرح کی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ کئی ہنگامی تحریکیں اُبھرتی ہیں اور بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ــــ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ــــ ان کی پستی و ذلّت کے اسباب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اس قوّت کے سرچشمہ کا سراغ لگانا چاہیئے جو ان کے عہدِ خوش بختی میں کارفرما تھی۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قوّت، یہ روح، قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی بدولت تھی۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم دنیا میں زندگی کی قوّتیں سلب کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ زندگی اور قوّت کا پیغام بن کر آیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ﴿۸/۲۴﴾

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی دعوت پر لبّیک کہا کرو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو زندگی بخشنے والی ہے۔

یہ پیغامِ حیات اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو دنیا میں اَقْوَمْ ہے۔ وہ ہر اس قوم کو جو اس راہ پر

گامزن ہوتی ہے، شاد کامی و کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔

یقیناً یہ قرآن اس روش کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے سیدھی راہ ہے (اَقوَم) اور مومنوں کو بشارت دیتا ہے کہ اگر انہوں نے عملِ صالح کئے تو ان کے لئے اجرِ کبیر ہوگا۔ (۱۷/۹)

ظاہر ہے کہ جب یہ قوم تمام دنیا کی تہذیبوں کی مالک بنی تھی تو اسی راہِ فلاح پر جادہ پیما ہونے سے بنی تھی۔ اور اگر یہ آج نکبت و افلاس کے ذلیل ترین گڑھوں میں پڑی ہوئی ہے تو اس کی ایک اور صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ اس نے قرآنِ کریم کے دامن کو چھوڑ رکھا ہے۔ حالت آج یہ ہے کہ قدم چلتے ہیں اور مسافت طے نہیں ہوتی۔ ہاتھ اُٹھتے ہیں لیکن ہلاکتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہیں رُکتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۹)

یہ اس لئے کہ انہوں نے قرآنِ کریم سے مُنہ موڑ لیا سو اللہ نے ان کے اعمال غارت کر دیئے۔

اس باب میں وہ لوگ جو دانستہ قرآنِ کریم سے اعراض برتتے ہیں اور وہ جو غلط تعلیمات کو حسنِ عقیدت کی بناء پر قرآنی تعلیمات سمجھتے ہیں، اور باوجود متنبہ کئے جانے کے پھر بھی اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتے ہیں، دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ اگر سنکھیا کو زہرِ قاتل سمجھ کر کھاؤ تو اور تریاق سمجھ کر نگل جاؤ تو، ہلاکت دونوں صورتوں میں لازمی ہے۔ یہی وہ ہلاکت ہے جس کی طرف قومیں بتدریج غیر محسوس طور پر کھنچی چلی جاتی ہیں۔

اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں انہیں ہم بتدریج (تباہی کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس طرح کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ (۷/۱۸۲)

قرآن کا کس قدر واضح حکم ہے، جس کی مسلمان اس دیدہ دلیری سے مخالفت کرتے ہیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک مفصل کتاب تمہارے پاس بھیجدی ہے۔

یہی وہ وقت تھا جس کے لئے قرآن نے کہہ دیا تھا۔

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوےٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل کی گئی ہیں (اور) اپنے مقدمات شیطان کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بہکا

کر گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ (۴/۶۰)

یہی وہ واقعات ہیں جن کی رُو سے قرآنِ کریم کے فیصلے کے مطابق ایک مومن، مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک ہو سکتا ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۶)

اور اکثر لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہو گا کہ آپ اپنے متنازعہ فیہ امور میں احکامِ خداوندی کے مقابلہ میں روایاتِ کہن کو ترجیح دیں؟ رواج اور روایات انسانوں کے نقوشِ قدم پر بلا تحقیق و بلا تصدیق چلے جانے کا نام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اتباع صرف قرآن کا جائز ہے اور بس۔

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ○ (۷/۳)

اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے رفقاء کا اتباع مت کرو۔ تم لوگ بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

ایک مسلمان کے لئے یہ اتباع و اطاعت بہ جبر و اکراہ نہیں، بلکہ بطیبِ خاطر ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ قوانینِ الٰہی کے فیصلوں کو (کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو) کی حیثیت سے مانو، بلکہ اس فیصلے کے بعد اگر تمہارے دل میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہوئی تو ایمان جاتا رہا۔

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہیں ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ باہمی اختلافات میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ کرایا کریں اور پھر آپ کے اس فیصلہ کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔ (۴/۶۵)

یہ ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہو گی وہ بہر حال کھلی ہوئی گمراہی ہو گی، خواہ آپ اسے آباء و اجداد میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیں۔ اسی قسم کے فیصلوں کو قرآنِ کریم نے "زمانہ جاہلیت کے فیصلے" قرار دیا ہے (۵/۵۰)۔

○

قرآن اختلاف مٹانے کے لئے آیا ہے

قرآنِ کریم نے اپنے نازل ہونے کی غرض یہ بتائی ہے کہ اقوامِ عالم میں جس قدر اختلافات موجود ہوں ان کو مٹا دیا جائے۔

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ‌ ۙ وَهُدًى

وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ‏ ۝ (۱۶/۶۴)

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کو واضح کر دیں اور یہ ہدایت ورحمت ہے مومنین کے لئے۔

تاکہ نوعِ انسانی باہمی نزاعات واختلافات کی وجہ سے جس سبعیت و بربریت میں اُلجھ رہی ہے باہمی تشتّت و افتراق کے باعث جس وحشت و درندگی کا ثبوت دے رہی ہے اُس سے نجات حاصل کر کے صراطِ مستقیم اور راہِ سعادت پر گامزن ہو جائے جو وحدتِ انسانی کا راستہ ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں۔

سب تعریف اُس ذات کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ (۱۸/۱)

لیکن واحسرتا کہ جو قوم اپنے آپ کو حاملِ قرآن کہہ رہی ہے تمام دنیا کو ایک مرکز پر لانا تو ایک طرف، خود ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ہزاروں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ یہ حالت صرف عوام کی نہیں، بلکہ جنہیں عوام کے رہنما ہونے کا دعوےٰ ہے وہ خود اسی تشیع و تحزب کی آگ بھڑکانے میں ہمہ تن مصروف ہیں، اور اس چیز کو خدمتِ دین بتاتے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو ناری بتاتا ہے، حالانکہ ہر ایک گروہ اپنے سامنے قرآن لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ یہود ونصاریٰ پر قرآن کریم نے الزام یہ عائد کیا تھا کہ

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ

الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ‌ؕ (۲/۱۱۳)

یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا طریقہ مہمل ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا طریقہ مہمل ہے اور (طرفہ تماشا) کہ دونوں کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔

کیا بعینہٖ یہی حالت آج مسلمانوں کی نہیں ہو گئی؟ ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس علت کے اندر قدرِ مشترک کیا ہے؟ یہود ونصاریٰ کے متعلق جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، قرآن کا اعتراض تھا کہ انہوں نے اپنے رہبان واحبار کو خدا بنا رکھا تھا۔ یعنی حلت وحرمت، جائز وناجائز میں بجائے کتابِ الٰہی کے، انسانوں کے طرف رجوع کرتے تھے۔ اب دیکھئے مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ جب تک مسلمانوں کا کتابِ خداوندی سے تمسک رہا، دین کے معاملہ میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اختلافی امور میں

کتاب اللہ کی جگہ انسانوں کو مرکز بنا لیا تو وہی حالت ہوگئی جو یہود و نصاریٰ کی تھی! اور ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے. کسی مسئلہ کو سامنے لائیے، ہمارے زوایائے علمِ دین سے کبھی متحدہ آواز نہیں اُٹھے گی. ایک کچھ کہے گا اور دوسرا کچھ. اور سند میں ہر ایک کسی نہ کسی بزرگ کا نام پیش کردے گا. یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں تحریفِ لفظی بھی کی تھی اور اس کے ساتھ تحریفِ معنوی کی بھی کمی نہ تھی. اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الفاظ کے تحفّظ کی ذمہ داری خود لے لی. لہٰذا اس میں تو کسی انسان کا کچھ اختیار نہ رہا کہ کوئی کمی بیشی کر سکے. لیکن تحریفِ معنوی کا دروازہ تو ہر ایک کے لئے کھلا تھا. چنانچہ دانستہ یا نادانستہ، یہ تحریف اس انداز سے ہوئی کہ جو لباس کسی کے جی میں آیا قرآن کو پہنا دیا اور وہی لباس نفسِ قرآن سمجھ لیا گیا. اب اگر قرآن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے، شور اٹھتا ہے. اس لئے کہ اس سے انسانوں سے تعلق چھوڑ کر خدا سے تعلق وابستہ کرنا پڑتا ہے. اور انسانوں کی محبت "کحبّ اللہ و اشدّ حبّ" دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں سمائی ہوئی ہے. کعبۂ دل سے اس بت کدے کو نکالنا بڑے کرّے حنیف کا کام ہے. دل کے اس مرض کا علاج قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ملے گا. اس لئے کہ اس کا دعوٰے ہے کہ:-

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۵۷)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک موعظت کی کتاب آئی (جس میں) تمہارے سینے (کے روگ) کی شفا ہے اور وہ مؤمنین کے لئے ہدایت و رحمت ہے.

یعنی جس طرح تیرنا اُسے ہی آئے گا جو پہلے پانی میں اُترے، قرآنِ کریم کا یہ نسخہ شفا اسے ہی دے گا جو دل کو تمام غیر قرآنی خیالات سے صاف کرکے قرآن کی طرف متوجہ ہو جائے. اس کے برعکس ایسے قلوب کا خدا حافظ جن کے متعلق قرآن نے خود کہہ دیا ہے.

اور وہ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں ہمارے دل اس کی طرف سے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیں. ہم اپنا کام کر رہے ہیں. (۴۱/۵)

○

ان معروضات سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں. حال کے استحکام اور مستقبل

کی درخشندگی کے لئے ماضی سے وابستگی ضروری ہے۔ ماضی گزرے ہوئے حال ہی کا نو نام ہے۔ لیکن ماضی

ماضی پرستی

سے وابستہ ہونا اور ماضی کی پرستش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ علمائے سلف نے اسلام کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمارے لئے باعثِ افتخار و مایۂ ناز ہیں۔ اگر ہم آباء واجداد کے دنیاوی ترکہ کے وارث بننے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے باعثِ عزت سمجھتے ہیں تو ان کے علمی ترکہ کو ہم باعثِ ننگ و عار کیوں سمجھیں؟ اس ترکہ سے ہمارا وقار قائم ہے۔ لیکن ہر چیز کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنا بھی ضروری ہے۔ جیسے کسی کی تحقیر ناروا ہے، ویسے ہی اس کی شان میں غلو و افراط سے کام لینا بھی مستحسن نہیں۔ حضراتِ متقدمین، علم و بصیرت رکھتے تھے، لیکن تھے تو انسان ہی۔ خدا تو نہیں تھے۔ انہیں خدا کا مرتبہ دینا نہ ان کے حق میں اچھا ہے نہ اپنے حق میں۔ جس درجۂ امامت واجتہاد میں وہ پہنچے تھے، اس تک آج بھی پہنچا جاسکتا ہے، اور جو مسائل انہوں نے اپنے ماحول کو مدِنظر رکھ کر قرآن کی روشنی میں مستنبط کئے تھے آج کے ماحول کے مطابق ویسے ہی دساتیر و قوانین آج بھی مرتب کئے جاسکتے ہیں جن کا سرچشمہ وہی اصولِ دین ہوں گے۔ لہٰذا سب سے پہلے علماء حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس بات کو محسوس کریں کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا اور وہ اُمتِ مسلمہ کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مومن کی زندگی کی شان ہی یہ ہونی چاہیئے کہ اس کا آج، گزشتہ کل سے ترقی یافتہ ہو لیکن یہاں ہمیشہ یہ سبق دیا جارہا ہے کہ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ بدبخت ہے۔ لہٰذا ایسی قوم کا خدا حافظ۔

اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دُور ہے

اس میں شُبہ نہیں کہ آج الحاد و مادہ پرستی کا سیلاب اُمنڈے چلا آرہا ہے۔ لیکن ان میں سب سے بڑا سبب خود ہمارے علماء حضرات کا بے وجہ تشدّد اور بے معنی تنگ نظری ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلام کے احکام دو اقسام پر مبنی ہیں۔ ایک وہ جن میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری قسم ان احکام کی ہے جو اُمت کے عام حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں اس لئے اُن کے متعلق احکام بھی اٹل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا کہ ان کے لئے اصول تو وضع کر دیئے لیکن ان کی روشنی میں جزئیات ترتیب دینے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھا۔ اس دروازے

کو بند کر دینا' دین میں 'خلافِ منشاء خداوندی' سختی پیدا کر دینا ہے۔ اربابِ عقل و فکر کا فرض ہے کہ وہ قوم کی اقتصادی' معاشرتی' اخلاقی' سیاسی' معاشی ضروریات پر غور کریں اور انہیں اس دین کا راستہ بتائیں جو ان کے لئے ان ضروریات کا حل پیش کر سکے۔

○

اکاس بیل

آج مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لئے طرح طرح کی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں۔ انجمنیں' کانفرنسیں' جلسے' ریزولیشن' کمیٹیاں' تحریریں' تقریریں' غرضیکہ ہر ایک دوا اور ہر ایک دُعا بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ لیکن نہ دوا میں شفاء' نہ دعا میں اثر۔ قوم کی حالت روز بروز افسوسناک ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ اسلام تو ایک شجرِ مقدس ہے جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر یہ شجرِ طیب ہمیں بھی وہ پھل کیوں نہیں دیتا جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے؟ اس کا جواب واضح ہے۔ اس کی علت بالکل عیاں ہے۔ آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ بیری کے درخت پر بالخصوص اور دیگر درختوں پر بالعموم' ایک خاص قسم کی بیل پیدا ہو جاتی ہے' جسے اکاس بیل کہتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ تمام درخت پر چھا جاتی ہے۔ آپ اس درخت کو کتنا ہی سینچیے' اس کی کتنی ہی پرورش کیجئے' وہ کبھی برومند نہیں ہو سکتا۔ اس درخت کو آپ جتنی غذا پہنچانے کی کوشش کریں گے اکاس بیل اُتنی ہی بڑھتی جائے گی اور درخت سوکھ کر زرد پڑتا جائے گا۔ جب تک اس بیل کو اتار کر پھینک نہیں دیا جاتا درخت سرسبز نہیں ہوگا۔ قرآن کے شجرِ مقدسہ پر ایک مدت سے انسانی تعلیمات کی اکاس بیل چڑھی ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ اپنی دانست میں شجرِ اسلام کی تقویت کی جس قدر کوشش کر رہے ہیں وہ دراصل اس بیل' اس غیر جنس کی تقویت کا موجب ہوتی جاتی ہے۔ اسلام کی برومندی و بارآوری کے لئے سب سے پہلے اس بیل کو اتار کر پھینک دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل درخت کی پرورش خود بخود ہو جائے گی۔

ان گزارشات کے بعد کیا بادب دریافت کرنے کی اجازت حاصل کی جا سکتی ہے کہ

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ○

(۵۷/۱۶)

کیا ایمان والوں کے لیے اِس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت اور
اس چیز کے لیے جو حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے جُھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ
ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی، پھر ان پر ایک زمانہ گزر گیا، پھر ان کے دل
سخت ہو گئے اور بہت سے ان میں سے فاسق ہیں۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

(نوشتہ اگست ۱۹۴۱ء)

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک رسم سی پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذہب[1] کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور یوں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئیداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم از کم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغامبر اور نوعِ انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسنِ سلوک اور وسعتِ نظر کی تعلیم ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعوٰی ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعتِ نظر، کشادگیٔ ظرف، رواداری، حسنِ سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے لیکن اس کی اس خصوصیت یعنی اس کی افضلیت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح اہل مذاہب کی دل شکنی ہو گی اور وہ اسلام کے نمائندہ کو "متعصب اور تنگ نظر" خیال کریں گے۔ لہٰذا رواداری اور کشادگی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہو کر اسلام کے نمائندوں کو

---

[1] اسلام کے لئے "مذہب" کا لفظ دوسروں سے تقابل کی خاطر لکھ دیا گیا ہے، ورنہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔

اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں۔

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس نقطۂ خیال سے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منتج نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصود ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پسِ پشت ڈال کر اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

اوائل جون ۱۹۴۱ء میں شولاپور کے مقام پر اسی قسم کی "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن، پنڈت سندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی، البتہ جنابِ صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع و منہاج (فروعات) میں ہے، اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، بلکہ شروع سے آخر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اوّل) سے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے۔ جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔

جنابِ آزاد کی تفسیر

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال و عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیشِ نظر ہیں۔ مجھے تو قرآنِ کریم کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رُو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی بجماً بجماً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا مؤید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے؟ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ عالمگیر سچائیاں سب

میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات وسعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہو سکتی۔ وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بین نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس سطحی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسرِ قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحرِ حلال بن جانے میں کونسی شے مانع ہو سکتی ہے؟

○

اکبر کا دینِ الٰہی

رواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس سراب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہِ اکبر کے دینِ الٰہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے، تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح وہ مساعیِ جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کے لئے مجاہدانہ انداز سے معرضِ وجود میں آئیں۔

برہمو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی اس لئے وہ ہمارے دائرہ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ اس نظریہ کی اشاعت کی موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالمِ دین اور مفسر کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا، سر پر اٹھایا اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی تعریف اور توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک خصوصیت ضرور ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا، لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں وفورِ شوق اور جوشِ عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ برنگ خود بینی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس اژدحامِ مدح وستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہلِ نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی۔ چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری ۱۹۳۳ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی اس

مضمون کو اربابِ نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے مختلف گوشوں سے جناب آزاد کے نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہو چکے ہیں۔ چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے تھے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گذرے، اس لئے ان کی یاد محو ہوتی چلی گئی (متفرق مضمونوں کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے)۔ اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے اس لئے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا، میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلہ طلوعِ اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا، لیکن بایں ہمہ یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ تا وقتیکہ انہیں بہ تسلسل نہ رکھا جائے، بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذاہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے، اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظامِ زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جد و جہد بھی، جسے اس قدر اہمیت حاصل ہے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے[1]۔ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العین حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا سطحِ نظر (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہوگا، اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریہ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی، قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو دونوں لائنوں میں انچ بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے، لیکن اس کا کانٹا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل ہی سے کوسوں دُور ہو جائے گی بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میرے نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

○

---

[1] حصولِ پاکستان کی تحریک کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آجکل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش کی طرف آرہے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب کو سب سے اعلیٰ وارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے اس طرح وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث و مناظرات کے اکھاڑے قائم ہوا کرتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اوّلیت وافضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے، اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی تلقین کی جارہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث وجدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور اس سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں، لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں، جس چیز کو وہ دیگر اہلِ مذاہب کی وسعتِ نگاہ اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ (مثلاً زید) کا ایک بچہ ہے۔ بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچے کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو عمر کی خود ستائی ہے کہ اپنے بچہ کے برابر کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں!

تنگ نظری کا طعنہ

فرمایئے کہ یہ اصول، زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غماز؟

دورِ حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کو دقت پیش آرہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم وعقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں، نہ ان کے اصول وضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریا اور گوناگوں مقتضیات کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے اِدھر اُدھر سے اصول وقوانین مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اس لئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذاہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جارہی ہے کہ انہیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے اربابِ حل وعقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیشِ نظر ان کے مذاہب کے پیرووں

سمجھ دار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائے. ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنے مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہبِ عالم سے اعلیٰ و افضل ہے، کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے. اس لئے انہوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچے کے متعلق اختیار کی تھی. انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جا سکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے اور اس طرح ان کے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں. اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار نہ ہو جایئے کہ اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے. وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے. اس اعتبار سے سب یکساں ہیں. باقی رہا نظامِ زندگی، سو وہ مذہب سے الگ شے ہے. اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے. اس لئے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں رازِ حیات ہے. ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے. یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو "وحدتِ ادیان" کے نقاب میں چھپا لیا' اور قوم کی اجتماعیت کے لئے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کر لیا.

یہ ہیں وہ مقتضیات و عواطف جن کے ماتحت "یکسانیتِ مذاہب" کی یہ تحریک وجود کوش ہوئی ہے. آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے. لیکن ذرا اس شخص کی کیفیتِ قلب کا بھی تو احساس کیجئے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں. یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انہیں اس امر کے اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا. یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دینِ حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا. اور یوں اس کی افضلیت و اکملیت کا اقرار لیا جا سکتا تھا.

یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس دعوے کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ حیات اور نظامِ خداوندی دے کر بھیجا تا کہ وہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آ جائے. خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے.

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو، کہئے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ "تمام مذاہب یکساں ہیں" تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی علی الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرو گے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں، تو اسی قسم کا دعوے دوسرے اہلِ مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سوال تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بناء پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریاتِ زندگی سے تنگ آ چکی ہے اور انہیں تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریہ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکے۔ جن اقوام نے قومیت کو امن و سکون کا ضامن بنایا تھا وہ اب محض

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً نباہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے، تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمہ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا کون ہے؟ عمر کے لئے تو یہ چیلنج نویدِ مسرت ہے کہ اس کے اور زید کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے۔ اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے۔ ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریاتِ زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے پاک ہے۔ لیکن اس وقت میرا تخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں۔ اس وقت میں صرف انہیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ تخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریقِ استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا میرا تخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل، حال اور مستقبل کی سرفرازی و سربلندی، ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت فقط اس نہجِ زندگی (دین) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآن کریم

اور جس کے عملی پیکر محمد رسول اللہ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے' آپ کو (دوسروں کے پیمانوں کے مطابق) نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں" اس تنگ نظری پر" قربان کر دینی چاہئیں۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایہ رحمت میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے ایسا آسمان تلاش کر لیجئے جہاں جھوٹے کو جھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے۔ جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے۔ جہاں سچے سے اس لئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جہاں حقائق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہو جانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے۔ اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا' وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. جب یہ حقیقت ثابتہ ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں' تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لئے ہچکچاہٹ پیدا ہو ناکہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے' اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عمل شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

> اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ (۲/۱۵۹)
>
> جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں' باوجودیکہ ہم نے لوگوں کے لئے انہیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کے حصے میں آتی ہیں۔

جناب آزاد کے معتقدات

جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر تقریباً پونے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کے اخیر میں انہوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصہ بحث ہے جس سے پنڈت سندر لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

> لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔
>
> (الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب

سچے ہیں اس نے کہا دین خدا کی عام بخشش ہے اس لیئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(د) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں۔

(ھ) اس نے بتایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں کو اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں وہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا تمام مذاہب کی مشترک اور متفقہ سچائی یہی ہے۔ جسے وہ الدین اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد ۱ صفحہ ۱۶۳-۱۶۲ و ۱۹۴۷ء ایڈیشن صفحہ ۲۱۴-۲۱۳)

دوسرے مقام پر شرع و منہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو اصل حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن روح و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی

زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ (صفحہ ۱۲۷)

(۱۹۴۷ء ایڈیشن، صفحہ ۱۸۹)

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے۔ (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق و سباق کو ملا کر ملاحظہ کر لیں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رُو سے نجات و سعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور "نیک عملی" ہی کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدیہؐ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے۔ اور رسالتِ نبیِ اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعتِ قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام "نیک عملی" ہے)۔ یعنی ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ نجات و سعادت کے لئے ایمان بالرسالت، اور قرآنی شریعت کا اتباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآنِ کریم میں کفار و مشرکین کے علاوہ اہلِ کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان کے علاوہ نبیِ اکرمؐ سے پیشتر کسی نہ کسی رسول، اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رُو سے اہلِ کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہؐ اور اتباعِ قرآن پر بھی ایمان لائیں، یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر قرآنِ کریم اہلِ کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہؐ اور اتباعِ قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں، تو بات صاف ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب اہلِ کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہلِ کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں

دین سے کیا مُراد ہے؟

مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام و ملل میں، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت، اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل میں مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے فرق ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی

وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہوجاتے یا خود انسانوں کی دست برد سے ان میں تحریف والحاق ہوجاتا کہیں یہ فراموش ہی کردیئے جاتے۔ لہذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہوجاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہوجاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ یعنی انسانیت خود اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ لہذا اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت، کچھ تو گزشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (احکام) کی تجدید ہوجاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہوجاتا تھا، اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ لیکن یہ ترمیم و تنسیخ ہمیشہ ارتقاء وعروج کی طرف لے جاتی تھی۔ تنزل وہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی۔ ذیل کی آیتِ مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے فرمایا۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ۭ (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہوجانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس جیسا حکم آجاتا تھا۔ چنانچہ قرآن میں کتبِ سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلاف ڈالے گئے) يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۲/۷۹) (افسوس ہے ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے)۔

اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف، الحاق، فراموشی، دانستہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں۔ نیز اس حقیقت باہرہ پر خود دنیا شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو بہ دلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفہ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر پہ نازل ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کے لئے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں

چلتا۔[1] بہرحال یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشد و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے اور یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا، ان کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات دے دیئے جائیں جو قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات کے لئے مکتفی ہوں۔ اس طرح ان تمام حقائق و اصولات کو یکجا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دے دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ مجموعۂ حقائق اور ضابطۂ خداوندی کے اس (LATEST) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآن ہے۔ اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہو گئیں۔ ضابطۂ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آ گئیں۔ اب نجات و سعادت کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے 'منسوخ' ہے۔ اب دین ہے تو یہی 'اسلام' ہے تو اسی کا نام ایمان ہے تو اس پر۔ اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام، نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذالعمل تھے۔ اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔ اسی نے ان تمام کو سمٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا، اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطۂ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔ نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضرات انبیاء کرامؑ میں کوئی فرق ہے نہ پیغاماتِ خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرما دیا کہ اب اتباع و اطاعت صرف اسی مجموعۂ قوانین کی ہو گی جس کا نام قرآنِ کریم ہے۔ یہ ہے الدّین اور یہ ہے الاسلام۔ اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات و سعادت وابستہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن ہے کہ اصلِ دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے۔ (ترجمان القرآن، جلد ا، صفحہ ۱۳۷)۔

---

[1] ان امور کی تفصیلات کے لئے "معراجِ انسانیت" کا پہلا باب، دیکھئے۔

"موجود تھیں" اور "موجود ہے" میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے حق و باطل ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

○

ایمان سے مفہوم اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ قرآن نے ایمان کے پانچ اجزاء بتائے ہیں:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۝ (۲/۱۷۷)

بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ آخرت کے دن، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لائے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ (۴/۱۳۶)

اور اللہ اس کے ملائکہ، اس کی کتب و رسل اور یومِ آخر سے انکار کرے تو وہ بڑی دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور بعض مقامات پر اس کی تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے، اور سیاق و سباق اور نفسِ موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱/۳۰)

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا ذکر ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ (۲/۶۲)

جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عملِ صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (۳/۱۷۹) (پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ)۔ کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے۔ (فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴/۸) (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا)۔

غرضیکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شق اول ہے۔

○

ایمان باللہ سے مراد

اب شق دوم کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ، رسل، کتب پر ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کا اتباع کیا جائے (اَطِیْعُوا اللّٰہَ)۔ محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا، کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا، تعینِ صفات میں اختلاف ہوگا لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ۔ لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے (۲۹/۶۱-۶۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا

ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں (۹۰-۸۴/۲۳). اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم. چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتے ہیں اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں، اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے. خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا،

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط

(۷/۳)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے. خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت. قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی. وہ کتابیں ضائع ہوگئیں، محرّف ہوگئیں، یا ساقط العمل قرار پاگئیں. لہٰذا ان کی اطاعت بھی ختم ہوگئی۔ اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ان سب کے بعد نبیؐ آخر الزماںؐ تشریف لائے جن پر نازل شدہ کتاب (قرآنِ کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے۔ اس لئے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآنِ کریم کے اتباع میں مضمر ہے۔ اب نبیؐ اکرمؐ سے پیشتر کے رسولوں، اور قرآنِ کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے. اب وہ تمام احکام قرآنِ کریم کے اندر آچکے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵/۴۸)

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاوی کو) سچا کر کے دکھانے والی اور ان (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لئے ایک نئی کتاب آجانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی. ضابطۂ قوانین کے ہر نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھنا ضروری ہوتا ہے. لہٰذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے. بنا بریں قرآنِ کریم کے بعد، مختلف

اہلِ مذاہب (یا اہلِ کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہو کر زندگی بسر کرنا، اصولاً غلط ہے۔ اب "سچائیاں" (ان کے ہاں کی اور ان کے علاوہ وہ تمام جن کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہے) صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب کے آنے پر اسی رسول اور اسی کتاب کا اتباع ضروری ہوتا تھا۔ اس لئے ہر رسول سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اپنی اُمت سے کہہ دیں کہ جب رُشد و ہدایت آسمانی کے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجائے، جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آئے گی، تو تم سب کو اس آخری کڑی کا اتباع کرنا ہوگا۔ سورۃ اعراف کے انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں کہ بار الٰہا! تُو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ بیشک، ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں، لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ صرف ان کے حصہ میں آسکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے۔ یعنی ان کا اتباع کریں گے۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ .... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۱۵۶ — ۱۵۷)

وہ رحمتیں میں ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو نبی اُمی کا اتباع کریں گے جسے وہ تورات و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دے گا۔ بُری باتوں سے منع کرے گا۔ پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا۔ ناپاک چیزیں حرام کرے گا۔ اور وہ طوق و سلاسل جو ان پر پڑے ہوئے ہوں گے ان کو ان سے الگ کرے گا۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

غور کیجئے کہ فلاح و سعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے؟ نبی اکرمؐ پر ایمان اور قرآن کریم کا اتباع۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیائے کرامؑ کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ

ثُمَّ جَآءَكُمْ .... وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۸۴-۸۰)

جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے. پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے' تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی تائید کرنا. فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا' بے شک ہم اقرار کرتے ہیں. اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا. اور دیکھو تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں. تو اب جو کوئی اس عہد و اقرار کے بعد اس سے رُوگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں.

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں. اور بالآخر سب اسی طرف لوٹنے والے ہیں.

اے رسول تم کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے. ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے. اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں. تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا. اور آخرت میں اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے.

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے' اُن کی اُمتوں سے عہد لیا گیا تھا. چنانچہ کتبِ سماوی کے جو بچے کھچے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں' ان میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاءِ رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبیٔ آخر الزمانؐ) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے' کیونکہ یہی اس نظامِ خداوندی کا تقاضا تھا. لہٰذا نبیٔ اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد' حضورؐ پر ایمان کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں ہے. یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسرے میں فرق کرنے) کو پکا کفر قرار دیتا ہے. (۴/۱۵۰)

شقِ دوم سے ظاہر ہے کہ:

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انہیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔
(۲) تفریق بین الرسل کفر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغام رُشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔
(۳) نبیؐ اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے۔ اور چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ اس لئے قرآن کی اطاعت قیامت تک کے لئے ہے اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔
(۴) اب جو شخص، خدا، اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے جس طرح قرآن نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ (۲/۱۳۷)

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔

ایمان بالرسالت سے مفہوم

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ محمد رسولؐ اللہ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ تفریق بین الرسل نہیں۔ یعنی وہ حضورؐ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کے درجۂ رسالت و عبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے۔ (صفحہ ۱۱۹)

یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(۱) دوسرے انبیاء کرامؑ کی طرح نبیؐ اکرمؐ پر ایمان لانا ضروری ہے۔

لیکن

(۲) نجات و سعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ و دیگر انبیائے کرام

علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے کہ وہ منجانب اللہ تھے، لیکن اتباع صرف اس کتاب کا کرتے ہیں جو محمدؐ رسول اللہ کو ملی تھی، اسی طرح اگر عیسائی اور مُوسائی محمدؐ رسول اللہ کو منجانب اللہ سمجھ لیں، لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کا کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمدؐ رسول پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کرلیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شق دوم میں، قرآنِ کریم کی نصوصِ صریحہ سے واضح کیا جاچکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرمؐ (یا کتبِ سابقہ یا قرآنِ کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہوگا۔ یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی، یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر، ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی۔ اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور اس کی اطاعت بھی کی جائے، جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیشرو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعہ دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی۔ لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے لیکن نبیِ آخر الزماںؐ کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآنِ کریم کی باقی رہ گئی۔ اسی لئے اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کردی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا تفریق بین الرسل سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبیِ اکرمؐ) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ، اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کی جائے۔ اگر نبیِ اکرمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں، کفر ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلرَّسُولُ بِٱلْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَـَٔامِنُوا۟ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا۟ فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (۴/۱۷۰)

اے نوعِ انسانی! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آگیا ہے. سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لئے ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے.

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبیِ اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے. وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے. لیکن اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے. تو سوچئے کہ اس کے اس زبانی اقرار و ایمان سے مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضورؐ پر قرآن کریم نازل ہوا اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت و سعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، لیکن وہ اتباع و اطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا ہے، تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضورؐ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا. اگر وہ ایسا مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا؟ جو لوگ اس قسم کی "رواداری" اور "وسعتِ نظر" کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی ہیں. اور جو مسلمان انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ از روئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسول کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی کی جائے، تو وہ ان کے اس فریب پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے.

برہمو سماجی مسلک

خود ہندوستان میں برہمو سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں.

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اس کی پرستش کی جائے. خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے. بُت پرستی کی مخالفت کی جائے.

(۲) صحیفۂ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے.

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کیا جائے.

(۴) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے.

(۵) ظواہر و رسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے.

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس)

"رواداری" اور "وسعتِ نظر" کے تمام گوشے اس تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا

ہے کہ اس کے باوجود برہمو سماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ ہمیں ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی "حقانیت اور صداقت" کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآنِ کریم نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتنا نہیں۔ لیکن جو شخص قرآنِ کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدّعی ہو، اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہم نوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ (۷/۱۵۸)

(اے رسول!) ان سے کہہ دو کہ اے نوعِ انسانی! میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مارتا وہی جلاتا ہے پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبیٔ اُمّی پر، جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسولِ اکرمؐ کو خدا کا سچا رسول اور قرآنِ کریم کو سچی کتاب ماننے کے دعوے میں سچا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ قرآن کا اتباع نہ کرے۔ اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

○

اب شق سوم کی طرف آیئے یعنی کیا اتباع میں احکامِ کتاب کا اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر "خدا پرستی اور نیک عملی" ہی نجات و سعادت کے لئے کافی ہے۔ اس باب میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(د) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک

ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں. پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے. تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو.

(۴) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں .... ترجمان القرآن (صفحہ ۱۶۳/۱)

ان اقتباسات کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ کا حسبِ ذیل تشریحی نوٹ بھی قابلِ ملاحظہ ہے.

(۵) دینِ حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے.

(صفحہ ۲۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خدا پرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے، اور یہی اصلِ دین ہے، اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور طریقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق.

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رُو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جناب آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رُو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضربِ کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجرِ مقدس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آجاتا ہے. قرآن کی رُو سے نبی اکرمؐ سے پہلے جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ ایک نہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے. اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا. یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا. اس لئے ان کی وساطت

قرآن عالمگیر ہے

سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیشِ نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے. نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے یہ نظام

بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم، ملک، قبیلہ، گروہ یا کسی خاص وقت کے لئے نہیں۔ بلکہ آپ کا پیغام عالمگیر اور آپ کی مخاطب تمام نوعِ انسانی ہے۔ سارا قرآن اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے۔ حضورؐ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں، بلکہ دنیا کے ہر ملک میں، ہر زمانہ میں قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے حضورؐ کی رسالت یکساں ہے۔ اس لئے جو تشریعی احکام قرآنِ کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے حالاتِ خاص کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے، بلکہ وہ عالمگیر ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآنِ کریم کے تشریعی احکام صرف نبیٔ اکرمؐ کے زمانہ کے اہلِ عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے، تو اسلام کی عالمگیریت کا دعوےٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی لازم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں" اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ اسلام نوعِ انسانی کا دین ہے، اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھ کر اختیار نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکانکی طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباعِ احکام نہیں۔ یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں رُوح کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام صرف حضورؐ کے زمانہ کے حالاتِ زندگی کے پیشِ نظر اختیار کئے گئے تھے اور آج انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اور نجات و سعادت میں انہیں کوئی دخل نہیں۔ کوئی جاہل ہوتا تو ہم اسے ہم سمجھاتے بھی! ہم حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے، اور نظام کا ہر جزو، کل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکامِ قرآنی اس نظامِ اسلامی کے لاینفک اجزا ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا تغیر تبدل کر سکے، یا اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ "نجات و سعادت" ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ "نجات و سعادت" اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے، یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآنِ کریم کھول لیے اور دیکھئے،

کہ اس میں ان احکام کی "پابندیوں" کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اہلِ کتاب خدا کو بھی مانتے تھے۔ اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو (خاص حالات کے ماتحت) جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا اسی طرح اہلِ کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے وقت اہلِ کتاب کے خلاف جو فردِ جرم (چارج شیٹ) عائد کی گئی ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔

اتباعِ وحی

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (۹/۲۹)

اہلِ کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کریں۔

اس آیۂ جلیلہ سے حسبِ ذیل امور کی تصریح ہو گئی۔

(۱) اہلِ کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآنِ کریم ان کے اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ، جیسا کہ شقِ اوّل میں بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

(۲) اہلِ کتاب کا اس طرح پر ایمان لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام اور حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآنِ کریم نے عاید کی ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام صرف "خدا پرستی اور نیک عملی" (بزعمِ خویش) کا نام نہیں۔ بلکہ قرآنِ کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرما دی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اسلام میں داخل ہونا لازمی شرط ہے۔ دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبیٔ اکرمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لئے استعمال ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو ۹/۳۳ ; ۴۸/۲۸ ; ۶۱/۹)۔

مندرجہ صدر آیت کا مطلب بالکل واضح ہے. لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے. وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:۔

> اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ سچے دین پر عمل پیرا ہیں .... (ترجمان القرآن، صفحہ ۸۲)

ذرا غور فرمایئے. ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافے نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی؛ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ " یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور رسول نے حرام ٹھہرایا ہے" یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انہیں حرام نہیں سمجھتے. لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر کہ "جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے." یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ ان چیزوں کو حرام سمجھیں جو ان کی کتاب میں حرام ٹھہرائی گئی ہیں. اندازہ فرمایئے. قرآن کریم پر یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت؟ یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کس قدر بے باک ہے؟

○

گزشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآنِ کریم کی رُو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں. قرآن میں کسی جگہ، خواہ ان میں سے کسی ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا، مقصود اس سے پانچوں اجزاء ہیں. ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے.

(۲) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزوِ لاینفک ہے.

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے.

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرمؐ کی بعثت کے بعد اطاعت خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی.

(۵) قرآن کے تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریہ (یکسانیتِ مذاہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (۲/۶۲)

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود و نصاریٰ اور صابئین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پہ ایمان لائے اور عمل اچھے کرے ان کا اجر ان کے اللہ کے پاس ہے۔ اور ان کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں۔

ایک اہم آیت اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور صابئین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ جو کچھ ہم اس وقت لکھ چکے ہیں اس کے پیشِ نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان مقصود نہیں، بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا

اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے۔ تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں؛ اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہوگا۔

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو (نسلوں اور قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا۔ توریت، قومِ بنی اسرائیل (یہود) کے لئے۔ مذہب عیسوی بھی انہی کے لئے، کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔

بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی ورنوں کی رُو سے ہوتی ہے اور ورنوں کی کیفیت یہ ہے کہ نہ نچلے ورن کا ہندو اوپر کے ورن میں جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حریم قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودی کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابناء اللہ (خدا کی اولاد میں) داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ یعنی مذاہبِ عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ:-

(۱) نجات و سعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے۔ اور

(۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رُو سے ہوتا ہے) اس لئے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں (واضح رہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصوّر ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے)

قرآن نے آکر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی، نصرانی، صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے۔ اور اعمال صالحہ کرنے سے جنّت کا اہل بن جاتا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۶۲) باقی رہے مسلمان سو انہیں بھی اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہیئے کہ وہ محض اس لئے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انہیں بھی اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ثابت کر کے اعمالِ صالحہ کے ذریعہ جنّت کا مستحق بنانا ہو گا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورۃ نساء میں ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ (۴/۱۳۶)

اے مسلمانو! (ایمان والو!) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان

محض زبان تک تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا اور نہ اعمالِ حیات اس کے مصدق۔ (انہیں منافق کہا گیا ہے)۔ زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی لیکن میدانِ جہاد، ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ اِدھر اُدھر کی بہانہ تراشیوں سے بچ کر نکل جانے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ "اصطلاحی" مسلمان تھے۔ ان کا ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابلے میں وہ پکے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ۝ (۹/۴۴-۴۵)

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیتِ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور سے سامنے آگئیں۔

(۱) ظاہر ہے کہ وہ اہلِ ایمان (سچے مسلمان)، جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے۔ مسلمان کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے سہتے تھے۔ لیکن قرآن ان کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۳) لہذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا پیدائشی مسلمان ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہیئے

اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہیئے. یہ ہیں سچے مومن.

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ○ (۴۹/۱۵)

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں) انہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کریں. یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان).

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لئے "نجات وسعادت" حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآنِ کریم نے متعین کیا ہے. پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیب خاطر منظور کرتا چلا جائے. حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے اوپر عاید کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے. اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو. یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصوّر کرے. تب جاکر کہیں "نجات و سعادت" کا متوقع ہو. اس کے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اُٹھ کر اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق "خدا کی بھگتی" کرلے اور کبھی کبھار "دان" (خیرات) کردے. مثلاً چڑیوں کو دانہ ڈال دیا. سانڈ کے لئے چارہ خرید دیا. کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پر آٹا ڈال دیا. اس سے آگے بڑھے تو کہیں پیاؤ بنوا دیا، اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا. سرائے یا ہسپتال بنوا دیا. دان (خیرات) کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں. اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت' نہ اسلامی احکام کی کٹھن منازل طے کرنے کی حاجت. نہ ہجرت کی صعوبات اٹھانا ضروری' نہ خدا کی راہ میں سر کٹوا دینے کا سوال درپیش. (بلکہ وہاں تو جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ چیز اہمسا میں داخل ہے). یہی نہیں' بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے' اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کرلے اور جس نظام کے ماتحت چاہے زندگی بسر کرے' وہاں انسانی نظام اور خدائی نظام کا سوال ہی کچھ نہیں. اسے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے. اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پاجائے گا. اب ـــــ

سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام کدو کاوش کا منتہیٰ ٹھہرا حصولِ نجات، اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہو اور دوسری طرف اتنی آسانی سے، تو وہ کون سا "صحیح العقل" انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریقِ زندگی اختیار کرے جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو. اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو، تمہارے لئے نجات یقینی ہے. اگر "رواداری اور وسعتِ نظر" کی "صلح کل" روش اختیار کر لی جاتی تو نہ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھتی، اور نہ کوئی برسرِ پیکار ہوتا. نہ حضورؐ اور آپ کے متبعین کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا. نہ مکہ چھوڑنا پڑتا، نہ مدنی زندگی میں اس قدر غزوات و سرایا کی ضرورت پڑتی. ساری دنیا خوش ہو جاتی اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان مل جاتا. اور پھر اس کے بعد آج تک جو چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے، اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا. ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) مومن ہوتی اور کفر و اسلام اور حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا.

خدا پرستی اور نیک عملی

"خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے. سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا (پرستش) کر لے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار، اور جسے برا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کر لے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جس کے لئے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے. یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے. انہی الفاظ میں "پرستش" کا لفظ بھی داخل ہے. دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا پرستش اور پوجا کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے. لیکن اسلام میں اس کے لئے "عبودیت" کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے. اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی

ہیں جو یکسانیتِ مذاہب تک منجر ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصوّر، انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے۔ جب انسانیت اپنے عہدِ طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی۔ جنگلوں اور غاروں میں رہائش۔ پھل اور شکار، ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے علاقہ نہیں۔ اس زندگی میں "خدا" کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے۔ خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کودنے سے جشنِ شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا، دیوی، دیوتاؤں کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھیں۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحیِ آسمانی کی روشنی آگئی۔ اس نے انسانی تصوّرات کے ان غلط پردوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصوّر پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی۔ رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جل کر رہنے کی طرح ڈالی۔ اب انفرادیت سے قبائل کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا۔ اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ احکاماتِ الٰہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رُو سے انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع، حاکم اور محکوم کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہیں رہتی تھی اس لئے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی، خدا کے متعلق حاکم اور فرمانبردار کا تصوّر بھی گم ہو جاتا اور پھر وہی پرستش کا ابتدائی تصوّر غالب آ جاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا، تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کی تمام جدّوجہد کا منتہیٰ اجتماعیت کی تشکیل قرار پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ضابطۂ حیات دے دیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کے لئے مکمّل ترین صورتوں کے لئے آئین و قوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جس قدر آئین و ضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوو ارتقاء کے راستہ میں حائل ہوں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطۂ حیات کی رُو سے ہو سکتی ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآنِ کریم کہتے

ہیں. اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جدّوجہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے. یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ، خدا کی بادشاہت قائم ہو، اور اس طرح انسان اللہ کے سوا کسی اور کا عبد نہ بنے. یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق. یعنی عبد اور معبود، محکوم اور حاکم کا تعلق. عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام قوّتوں کو نظامِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے. اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے قرآنی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا. یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے. وہ مفہوم جو انسانیت کے عہدِ طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دَور کی یادگار ہے. اس معنی میں "خدا پرستی" تو ہر مذہب میں ایک جیسی ہو سکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے. اس لئے جس ضابطۂ خداوندی کی رُو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جا سکتی ہے وہ آج قرآنِ کریم کے باہر اور کہیں نہیں. اسلام کا مطالبہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کا ہے. خدا پرستی (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش کرنے) کا نہیں.

ایمان کا صحیح مفہوم

لہٰذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت کو جائز نہیں سمجھتا. باقی چاروں اجزائے ایمان اسی اصل کی شاخیں ہیں. یعنی :-

(۱) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار	اللہ پر ایمان
(۲) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رُو سے اختیار کی جائے گی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور جس کی آخری شکل قرآنِ کریم ہے.	کتابوں پر ایمان
(۳، ۴) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل ہوتے رہے. اس سلسلہ کی آخری کڑی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں.	ملائکہ اور رسولوں پر ایمان
(۵) اس طرزِ زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں.	آخرت پر ایمان

یہ ہے قرآنی ایمان سے مفہوم۔ ان اجزائے ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا، مقصد پورے کے پورے نظام سے ہے۔

اب رہی "نیک عملی"۔ سورۂ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں رہتی۔ ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اُٹھے نیک ہے، اور جو اس کے خلاف ہو بُرا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باللہ سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا اسی طرح اس نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا۔ اس زمانے میں زندگی انفرادی تھی، اس لئے نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ دیکھتا کہ ان میں کا ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے، ضعیفوں کی مدد کرتا ہے، جانوروں پر شفقت کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدّن کے اساس و مبانی کیا ہیں؟ وہ انسانوں کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتی ہے؟ دنیا پر اس تہذیب و نظام کے اثرات کیا ہیں؟ اگر اس کے اثرات انسانیت کُش ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی "نیکیاں" (مثل خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پا سکتیں۔ جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو رہیں گے ان کا کوئی عمل، عملِ صالح نہیں کہلا سکے گا۔ کسی کی رگِ جان پر جونکیں لگا دینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں شربت ٹپکانا، سطحی نگاہوں میں ہی نیکی قرار پا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم، نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے جس کا مفہوم تمام نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ ہے۔ اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے۔ ایک شخص بڑا مخیر ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ غریبوں کی امداد کرتا ہے۔ عادات و خصائل نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن حکومتِ وقت کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے، تو حکومت کی نگاہوں میں وہ جرم ایسا سنگین ہے کہ اس کی "ذاتی نیکیاں" اس کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اور اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے، اور اس کے خلاف زندگی کا نام کفر

ہے. اب آپ خود ہی اندازہ فرمائیے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں؛ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں) یعنی جن اعمال کو وہ بزعمِ خویش نیک سمجھتے ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں. اس لئے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا. آپ چاک کو کونین سمجھ کر صبح وشام پھانکتے رہیئے، ملیریا کبھی دُور نہیں ہوگا.

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُھُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً .... فَمَالَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ۝ (۲۴/۴۰-۳۹)

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی) چیز اسے نظر نہیں آتی البتہ وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے. یا (ان کے اعمال) ایک بحرِ ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور ان کے اوپر (سیاہ) بادل، تو بر تو ظلمات (ایسا کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو سجھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی.

اس لئے کہ یہ لوگ نظامِ حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں، حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں. نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے. سورۃ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے، کیسے دل نشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے. اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا.

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰھَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۝ (۹/۱۹)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوا دینا) یا خانہ کعبہ کی خدمت (کرنیوالا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستہ میں جدوجہد کرتا ہے (تمہاری سطح بیں نگاہیں کچھ ہی کہیں) اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے. اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا.

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآنی معیار کے مطابق نیک عملی کسے کہتے ہیں۔

○

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لئے کسی خاص نظامِ زندگی کی ضرورت نہیں۔ "خدا پرستی اور نیک عملی" جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے، نجات کے لئے کافی ہے، کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے؟ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا۔ وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعوے کا اعلان و تبلیغ، نوعِ انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض اِدھر اُدھر کے بے قاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں، بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اس کی طرف سے ہو گی جو یہ کہے گا کہ نہیں سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں۔ جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھواؤ اور دوائی خرید لو۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانے سے مل سکیں گے (باقی دواخانے ہمارے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دھوکا دیتے ہیں) تو ہر دواخانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ اِنَّ فِیۡہَا اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ۔

○

اسلام دین ہے

اس مقالہ میں اسلام کے لئے بھی مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام درحقیقت مذہب نہیں، دین ہے۔ اس لئے اسلام کا مذاہبِ عالم کے ساتھ مقابلہ ہی غلط ہے۔ جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی ہیں نظامِ حیات۔ اس لئے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر نظامہائے حیات کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کے اتباع میں اور لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں۔ جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام

میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا. اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے. جب مقصد پوجا پاٹ ٹھہرا تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا' اور مسجد میں کر لی تو کیا؟ جب مقصود دیا ترا ہو جائے تو ہر دوار چلے گئے تو کیا اور مکے ہو آئے تو کیا؛ جب مطلب دان (خیرات) سے ہو تو کسی کو بھیک دے دی تو کیا اور زکوٰۃ دے دی تو کیا. اس تصور کے ماتحت فی الواقع "خدا پرستی اور نیک عملی" سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے. بلکہ اس کے لئے "خدا پرستی" کی شرط بھی بے معنیٰ ہو جاتی ہے. ضوابطِ اخلاق (سچ بولو، جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرام نہ کھاؤ، زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں. حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی ان ضوابط کو اچھا کہتے ہیں. اس اعتبار سے خدا پرستی بھی کچھ ضروری نہیں رہتی. ان ضوابطِ اخلاق کا نام "سچا دین" قرار پا جاتا ہے. چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے. اس لئے ان کے ہاں بھی خدا سے صرف پوجا پاٹ کا تعلق باقی رکھا جاتا ہے' اور نیک عملی ان ضوابطِ اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے. چند عقائد. چند عبادات کی شکلیں' اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں، بس ان کے مجموعہ کا نام ہے اسلام. اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں. ابوالکلام صاحب کے پیشِ نظر بھی اسلام کا یہی تصور تھا اس لئے ان کا نتیجہ مستخرجہ بھی ٹھیک تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں. ان میں اور باقی مولوی صاحبان میں فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی. ورنہ عملاً ہر مولوی کا یہی عقیدہ ہے' خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے، یا یوں کہئے کہ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے.

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں ایک نظامِ حیات ہے' تو پھر اس بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں. یہ ظاہر ہے کہ ہر نظامِ حیات ایک خاص ذہنیت کا متقاضی ہوتا ہے. جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا. ایمان اس خاص ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے. قرآن کی رُو سے تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی نظامِ حیات ہے. لہٰذا تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی اندازِ ایمان ہے. اسلام کے اس قرآنی تصور کی رُو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نظام ہر قوم اور ہر مذہب میں ایک جیسا ہے. یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں نہیں. اس لئے تقابل کا سوال ہی سامنے

نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر کی پوری عمارت اُٹھتی ہے۔

وراثتِ ارض کا ابدی قانون

(نوشتہ اپریل ۱۹۴۹ء)

نظامِ کائنات ایک معینہ قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے چھوٹے سے چھوٹے ذرۂ خاک سے لے کر بڑے سے بڑے کرۂ سماوی تک، ہر شے زندانیٔ تقدیر ہے۔ آفتاب جہانتاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دریچۂ مشرق سے جھانکتا ہے اور ایک متعینہ شاہراہ پر چل کر ہر شام حجلۂ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کے دورانِ سفر میں، ہر وہ شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے اس کے نور و حرارت سے اپنے سینہ کو بھرپور کر لیتی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ؕ (۳۶/۳۸)۔ چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق، ایک غوطہ خور کشتی سیمیں کی طرح، دریائے نیل سے اُبھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تابع پھیلتا اور سمٹتا ہوا اپنے سفر کی منازل طے کئے جاتا ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ (۳۶/۳۹)۔ جب خزاں کی دست درازیاں صحنِ گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو مشرقی پنجاب[1] کے مسلمانوں کے متاعِ حیات کی طرح ختم کر دیتی ہیں، تو فطرت کے ایک معینہ قاعدہ کے مطابق نسیمِ بہار، مسرت اور شادمانیوں کی ایک رنگین و عطر آگیں دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے اور زمین کے حسرت زدہ، غم آلود چہرے کو پھر سے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتی ہے (وَكَذٰلِكَ) اَللّٰهُ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷/۱۸)۔

---

[1] تشکیل پاکستان کے وقت، مشرقی پنجاب، ہندوستان کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے بری طرح تہ تیغ کیا تھا۔ بقیۃ السیف خاماں برباد، پاکستان کی طرف آگئے تھے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنّٰتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ۝ (۳۶/۳۴)

جس طرح یہ قوانین وضوابط خارجی دنیا میں جاری وساری ہیں اسی طرح انسان کی داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں انہی سواحل میں محصور رہے اسی طرح اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا یم بیکراں بھی انہی حدود و ثغور میں مقید ہے۔ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ نظامِ حکومت اور آئینِ مملکت کا ہے جسے قرآن "وراثتِ ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کیسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی ہے اور کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون مقرر ہے۔ جو سورۂ انبیاء کے ان بصیرت افروز الفاظ میں مرقوم ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا
عِبَادِيَ الصّٰلِحُونَ ۝ اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِينَ ۝
(۱۰۵–۱۰۶/۲۱)

اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے "صالح بندوں" کے لئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں) عبودیت اختیار کرنے والی قوم کے لئے ایک (عظیم القدر بصیرت افروز حقیقت کشا) پیغام ہے۔

امانتِ حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ ابدی قانون اور سرمدی اصول ہے جس کا نوشتۂ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور اُمتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ یہی کہ وراثتِ ارض کے لئے صلاحیت شرط ہے۔ یعنی وہی قانون جو عالمِ آفاق میں بقاء للا صلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری وساری ہے۔

صَلاح کے معنی

"صلاح" دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ صالح کے معنی ہیں صحیح وسالم، تندرست و توانا، مستوی الجسم اور متناسب الاعضاء، زندگی کی تمام صلاحیتوں کو لئے ہوئے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے کہ جنین کی پیدائش سے پہلے میاں بیوی دونو

خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اٰتَیۡتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ ○ (۷/۱۸۹) خدایا! ہمیں صحیح و سالم تندرست و توانا بچہ عطا کر دے تاکہ ہم تیرے شکرگزار بنیں فَلَمَّاۤ اٰتٰىہُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیۡمَاۤ (۷/۱۹۰) لیکن جب اللہ انہیں تندرست و توانا بچہ عنایت کر دیتا ہے تو اس بارے میں اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک بنانے لگ جاتے ہیں۔ اس جگہ صحیح و سالم اور تندرست و توانا بچہ کے لئے صٰلِحًا کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اس کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اس کے لئے دعا کی تو اللہ نے ان کی رفیقۂ حیات کو جو عقیم تھیں، اولاد کے قابل بنا دیا۔ وَ اَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ (۲۱/۹۰) لہٰذا اصلاح کے معنی ان قابلیتوں اور استعدادوں کا پیدا ہونا ہے جن سے تعمیری نتائج مرتب ہوں۔ ان ہی معنوں میں یہ لفظ سورۃ النور میں استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے (جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے) جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہیں وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ (۲۴/۳۲) ان کے نکاح کر دو۔

ان آیات سے صلاح و صالح کے معانی ہمارے سامنے آ گئے جن سے واضح ہو گیا کہ اس قانونِ سرمدی کی رُو سے جو ہمارے موضوع کا محور اور اس زندگی بخش داستان کا زیبِ عنوان ہے، زمین کی وراثت (حکومت و مملکت) کے مستحق وہی ہیں جو اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں۔ جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں، جن کے سینوں میں دم، اور جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جِلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو، جو دنیا میں عزت اور شوکت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اور اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کے لئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قومِ مخالف ان کے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں۔ دنیا میں جس کے پاس قوت نہیں، اس کا کوئی دعوےٰ سچا نہیں۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو وعظ اور اپدیش بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اُس قانون کے ساتھ

جسے دنیا میں دین کی حیثیت سے متمکن رہنا مقصود ہو فولاد کی شمشیر جگر دار کی بھی ضرورت ہے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (۵۷/۲۵) ہم نے ضوابطِ دین اور میزانِ عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدّت کی سختی ہوتی ہے لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) تاکہ لوگ جادۂ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　　کائناتِ زندگی را محور اند

یہی وہ قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

جس قدر قوت کے ساز و سامان اور گھوڑوں کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو اسے تم اللہ اور اپنے دشمن کے مقابلہ کیلئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباط الخیل کی جامعیت میں تمام سامان و آلاتِ حرب و ضرب، ساز و یراقِ جنگ و قتال اور وسائل و اسبابِ مدافعت و محاربت شامل ہیں۔ زمانہ کے مقتضیات اور احوال و ظروف کے تبدل و تغیر سے ان اسباب و ذرائع کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن قوت کی وہ رُوح جو زندگی کی اصل ہے، ہر جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ گوپیے کے پتھر سے لے کر ایٹم بم کے گولے تک، تمام اسباب، قوت کی روح کے مظاہر، فلہٰذا ایک ہی اصل کی شاخیں، ایک جان کے پیکر اور ایک ہی تلوار کی نیام ہیں۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں، وہ قوت مصافِ زندگی میں اس صورت کی رہ جاتی ہے جس طرح فلک پیما طیارہ کے مقابلہ میں "راجہ جی کی بہلی"۔

بہرحال دنیا میں زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو، آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی قوت ہو۔ لہٰذا حکومت و مملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے جس میں جہانبانی و جہانداری کی صلاحیتیں ہوں اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔

○

یہاں تک صالحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام خالص مادی قوت

(PHYSICAL POWER) ہے. لیکن قرآن کی رُو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہوجاتی. اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں. حزب اللہ اور حزب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں. جو بھی مادی قوت حاصل کر لے وہ غلبہ و استیلاء حاصل کر سکتا ہے اور اس طرح صاحبِ حکومت و سلطنت بن سکتا ہے. آج دنیا میں جس طرف نگاہ ڈالیئے انہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا. جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان و ذرائع زیادہ ہیں وہی سب سے بڑی سلطنت و حکومت کا مالک ہے. اور یہ صرف آج ہی پر کیا موقوف ہے؟ دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے. ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے ابھرے ہوئے آتشیں الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی.

فساد اور صلاح

لیکن جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے' قرآن کی رُو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہوجاتی' اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلاء اور تسلط و تمکن سے اصلاح پیدا نہیں ہوتی. اس نے بتایا ہے کہ اصلاح و فساد دو الگ الگ نتائج ہیں جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں. جو نظامِ سلطنت فقط مادی قوتوں کے استیلاء پر قائم ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے. سورۂ شعراء میں دیکھئے' اس حقیقت کو کس قدر واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۝ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۶/۱۵۲)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو. اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں. اصلاح نہیں کرتے.

سورۂ نمل میں اسی ضمن (قصۂ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ

وَكَانَ فِى ٱلْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۷/۴۸)

اور اس شہر میں نو اکابر (ارکانِ مملکت) تھے جو ملک میں فساد برپا کر رہے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے.

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں کہا گیا ہے کہ

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۲/۱۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ عہدِ قدیم نماردو فراعنہ سے لے کر عہدِ حاضر کے "ہٹلران دچرچلان" میں سے کسی سے پوچھئے' ہر پیکر فساد واستبداد یہی کہے گا کہ ہماری غرض اصلاح ہے۔ مفسدین دوسرے ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں ہر فریق متخاصم کی زبان پر یہی تھا کہ ہم حق وصداقت اور عدل وانصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اب بھی مغربی بساطِ سیاست کے ہر مہرہ باز کا یہی اعلان ہے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ لیکن قرآن کی رُو سے ہر وہ نظام جو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتا ہے باطل کا نظام ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ (فساد کے معنی ہی ناہمواری ہے)۔ اصلاح (معاشرہ میں ہمواریاں) صرف اس نظام کا نتیجہ ہے جس میں قوت کا استعمال آئینِ خداوندی کی تنفیذ وترویج کے لئے ہوتا ہو۔ اس نظام کا فطری نتیجہ "ربوبیتِ عامہ" ہوتا ہے جس سے مفہوم ہے ایسی فضا جس میں ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کے اُبھرنے' نشوونما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کے لئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ شرفِ انسانیت اسی نظام میں ارتقائی منازل طے کر کے اپنی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ محکومیت' اطاعت' صرف احکامِ خداوندی کی ہو گی۔ اور اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر شخص کی کامل نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت قائم ہو گی اس کا نام عملِ صالح ہے۔ اور ان دونوں (یعنی زندگی کے اس نصب العین اور اس کے مطابق پروگرام) کا نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یہی وہ استخلاف (وراثتِ ارض) ہے جس کے لئے صالحیت کی شرط ہے۔ یا یوں کہیے کہ جب اور جہاں اس قسم کی صالحیت پیدا ہو گی' وراثتِ ارض اس کا فطری نتیجہ ہو گا۔ اسی کا نام "اللہ کا وعدہ" ہے جس کا ذکر سورہ نور کی ان درخشندہ آیات میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)
اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان لائیں گے اور صالح العمل ہوں گے انہیں اللہ زمین میں حکومت عطا کرے گا جس طرح ان شرائط کے پورا کرنے والوں کو اس سے پہلے وراثتِ ارض کی نعمتوں سے مالا مال کیا گیا۔

یہ استخلاف (وراثتِ ارض) کس غرض کے لئے ہو گی؟ لَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ (۲۴/۵۵) تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (۲۴/۵۵) تاکہ ان کی حالتِ خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے اور یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا تاکہ یہ صرف قوانینِ الٰہیہ کے مطیع و محکوم ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔

یہ ہے وہ استخلاف (حکومت) جو وراثتِ ارض کے قانونِ سرمدی کی رُو سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک بنیادی فرق

لیکن اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کا صحیح جواب سامنے نہ آئے تو اصلاح اور فساد کا فرق نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور انسان تباہی و بربادی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صالحیت کی اس شرط کو پورا کرنے سے جو حکومت و مملکت عطا ہوتی ہے وہ اگر خدا کی طرف سے ملتی ہے (یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ)۔ تو جو حکومت و سلطنت فقط مادی قوتوں کے زور سے حاصل کی جاتی ہے کیا وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی؟ اگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی تو اسے کون دیتا ہے؟ اگر آپ بغور دیکھیں گے تو اس سوال کے ڈانڈے مسئلہ تقدیر سے جا ملیں گے۔ مسئلہ تقدیر کی بحث بڑی تفصیل طلب ہے اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج[1]۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ جس انداز سے یہ مسئلہ عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اور جس کی وجہ سے یہ قوم گزشتہ ایک ہزار برس سے راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، اس سوال کا محرک بھی وہی خیال ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے جسے (من جملہ دیگر اغراض و مقاصد) ملوکیت کے استبداد کے "شرعی جواز" کی غرض سے

---

[1] اس کے لئے دیکھئے "من و یزداں"۔

وضع کیا گیا، اور پھر سیاسی حیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلایا گیا کہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر اُمت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا، اور وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ہر قسم کی دولت اور قوت، حکومت و سطوت خدا کی نعمت، اور اس کی "عطا فرمودہ" قرار پا چکی ہے؛ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی گئی ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے؛ ہم جس دولتمند کا ذکر کرتے ہیں، بلا تأمل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر "اللہ کا بڑا فضل" ہے۔ ہر صاحبِ شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "اللہ کی دین" ہے۔ اس غیر محسوس عقیدہ کی رُو سے ہمارے نزدیک "دولت" خدا کی نعمت ہے۔ خواہ وہ کسی نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو یا اپنی محنت سے کمائی ہو۔ ہمارے ان قدیمی تصورات کی رُو سے "حکومت" اللہ کا انعام ہے خواہ اسے ابلیسی تغلّب اور طاغوتی سیاست کے بل بوتے پر قائم رکھا ہو یا ایمان و عملِ صالح کی بنا پر۔ غور کیجئے؛ ہماری زبان میں "اللہ کی دین" کے مقابلہ میں کسی اور کی دین کے لئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈاکو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مردِ کاسب کو بھی۔ لہٰذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے اس کے قانونِ وراثت (یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ) کے تابع۔ اور اس بناء پر صالحین کے معنی ہو جاتے ہیں ہر وہ گروہ جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کر لے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر فرعون کی حکومت بھی قانونِ خداوندی کی رُو سے ملی تھی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے خلاف اتنی بڑی مہم کے لئے کیوں مامور کیا گیا؟ اگر باطل کا دولتی نظام بھی اسی ابدی قانونِ وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کے لئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؛ حق و باطل کی یہ کشمکش و پیکار تو اسی بنا پر ہے کہ باطل منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر "قانونِ وراثتِ ارض" صرف حصولِ قوت ہی کا دوسرا نام ہے تو اس کے لئے عرشِ عظیم سے آنے والے پیغامات کی کیا ضرورت ہے؟ اسے تو دنیا کا ہر ہلاکو اور چنگیز خاں از خود جانتا ہے۔ اگر نیٹشے کا مافوق البشر، قرآن کا مردِ مومن ہے تو پھر حکمتِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی میں کیا فرق ہے؛ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظامِ حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانونِ وراثت کا نتیجہ، فلہٰذا من جانب اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ من جانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانونِ سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو۔ اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔

صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کا بعد اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ وراثتِ ارض (یعنی قوانینِ الٰہیہ

قوم کی مختلف حالتیں

کے مطابق حکومت قائم کرنے) سے پہلے عام طور پر قوم کی حالت یہ ہوگی کہ (۱) یا تو ان پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی. یعنی ان کی اپنی حکومت ہوگی لیکن اسی آئین کے مطابق جس کی رُو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں یا (۲) اسرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی اور یا (۳) وہ قوم کسی غیر حکومت کی محکوم ہوگی. اوّل الذکر صورت میں (یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو) اس قوم کو اس کی امکانی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے آئینِ خداوندی کے مطابق وراثتِ ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے. اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کی حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان و زیاں سمجھتے ہوں. اور اس لئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جائیں. ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فریقِ مخالف پر غلبہ حاصل کر لے گی، اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہجرت کر کے اسے اس آئین حکومت کی قرارگاہ بنالے گی. یہ وراثتِ ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا. نبی اکرمؐ کی دعوت کے وقت قوم مخاطب کی یہی حالت تھی. عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے. قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے. اس لئے انہیں امکانی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا کر کے وراثتِ ارضی کے مستحق بن جاتے. نبی اکرمؐ کی بصیرت افروز تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کر لی جس سے ان کے خفتہ جوہر بیدار ہو گئے اور وہ اصلح بن کر استخلاف فی الارض کے مقامِ محمود تک پہنچ گئی. رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ و ذٰلک الفوز العظیم.

بنی اسرائیل کی مثال

دوسری صورت کی مثال ہمارے سامنے قوم بنی اسرائیل کی ہے جو دعوتِ حضرت موسیٰؑ کے وقت فرعونِ مصر کے پنجۂ استبداد میں گرفتار تھی ان پر فرعونی حکومت کے مستبد قوانین مسلط تھے اس لئے وہاں رہتے ہوئے انہیں اس کی امکانی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے جوہرِ خوابیدہ کو بیدار کر کے ان میں نمود و بالیدگی پیدا کر سکیں. اس کے لئے آزاد فضا کی موجودگی نہایت ضروری تھی. یعنی بالفاظِ دیگر، صورت یہ پیدا ہو چکی تھی کہ

(۱) جب تک وہ اپنے اندر صالحیت نہ پیدا کر لیں آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی.

(۲) لیکن صالحیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک وہ فرعون کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہ ہو جائیں.

ظاہر ہے کہ ان حالات میں بنی اسرائیل کے لئے فرعون کی محکومیت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن بعض اوقات ایسے غیر متوقع حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن سے اگر بروقت فائدہ اٹھالیا جائے تو قوم کی گردن سے غیروں کی غلامی کا جوا اُتر جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس طرح سے آزادی کا حاصل ہوجانا اس قوم کی صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ہنگامی صورتِ حالات سے فائدہ اُٹھا لینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومیت سے نجات اسی انداز سے ملی تھی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کرلی تھیں جن سے غلامی کی زنجیریں کٹ گئی تھیں۔ ہوا صرف یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ آئے اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے زور پر قوم کو مصر سے نکال کر باہر لے گئے۔ اسی لئے قرآن نے اسے "عدل" سے تعبیر نہیں کیا بلکہ "احسان" سے تعبیر کیا ہے، جہاں فرمایا کہ

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝

(۲۸/۵ — ۶)

اور ہم نے چاہا کہ وہ لوگ جنہیں ملک میں غلامی و محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر بے حد کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور انہیں امام (قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں اور انہیں (حکومت و مملکت کا) وارث بنائیں اور (اس طرح) انہیں زمین میں متمکن کردیں۔

لہٰذا انہیں فرعون کی غلامی سے نجات، بطور انعام دلادی گئی اور انہیں ایمن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی، اور اس طرح ان کے لئے امکانی قدرت پیدا کردی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دے کر وراثتِ ارض کے مستحق بن جائیں۔

پاکستان کے مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثتِ ارض یا استخلاف ہے وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وراثتِ ارض بلا مزد و معاوضہ نہیں ملا کرتی۔ وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے قوم کی صلاحیتوں کا۔ انعاماً اور احساناً صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صلاحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہوجائے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک خطۂ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھا دیں۔
(۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلاء پیدا کر کے اس قسم کی سلطنت متشکل کر لیں جس قسم کی سلطنتیں دوسری قوموں نے قائم کر رکھی ہیں اور یا
(۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی اور بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھو بیٹھیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی لعنتی زندگی میں گرفتار ہو جائیں۔

ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اُس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ آیئے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وفیھا بصائر لقوم یعقلون۔

○

بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر قدم قدم پر تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہئیں تھے۔ یہ انعام کچھ چھوٹا انعام اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا۔ فرعون جیسے مجسمہ استبداد و قہرمانیت کے دستِ جور و ستم سے رستگاری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہرِ انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں غلامی ہزاروں لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص جنہیں جسدِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہیئے اس

قومِ بنی اسرائیل کی حالت

انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن اثرات کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے مقابلہ سے جی چراتا اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح اس عافیت کوشی کی زندگی کو عینِ حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلیِ احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں بار بار تاکید کرتے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ، انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ ذرا اپنے اندر صالحیت پیدا کرلو، وراثتِ ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (۷/۱۲۷)

تب موسیٰ نے (اپنی قوم سے کہا۔ قوانینِ خداوندی سے فتح و نصرت کی مدد مانگو اور (اس راہ میں) جمے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے جسے وہ اپنے بندوں میں سے انہیں دیتا ہے جو اسے اس کے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بندے جنہیں آخر الامر حکومت حاصل ہوتی ہے وہ ہوتے ہیں جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

لیکن اس تذکیر و تنذیر سے ان پیکرانِ آب و گل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑنا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے اور اُلٹے شکوہ سنج ہوتے کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے، اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب آرام سے گزرے گی، لیکن تم نت نئے دن ایک نیا مرحلہ سامنے لے آتے ہو۔ تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے؟

قَالُوْا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ (۷/۱۲۹)

انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچ رہی تھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں استخلاف فی الارض عطا فرمائے پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو!

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر تک محکومیت کے جراثیم گھر کر چکے ہوں، جو خوئے غلامی میں پختہ

ہو چکے ہوں، ان پر بھلا ان حیات آور خطبات اور زندگی بخش پیغامات کا کیا اثر ہوا؟ جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے تو وہ اس طرح پا بجولاں جا رہے تھے جیسے کہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہوں! جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر تعاقب میں آیا تو انہوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل کر لے آئے ہو؟

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ (۲۶/۶۱)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً (پھر) قابو آ گئے۔

تورات میں ہے:۔

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند کریم سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا کہ مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔ (خروج ۲—۱۰/۱۴)

غلامی کے اثرات

غور کیجیے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک کر باہر آ رہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گزاری اس سے کہیں بہتر تھی؟ اس سے بڑی بدبختی اور کس کی ہو گی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے؟ اور اس کے لئے دلیل یہ دے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خوفِ صرصر، کبھی فکرِ معاش ہے اور کبھی خدشۂ صیاد۔ قفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمہ ہوتے ہیں۔ اللہ اکبر! "حکمراں کی ساحری" بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی قلبِ ماہیت کر دیتی ہے، وہ بصیرتِ صحیحہ جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے۔ محکومیت

کی افیون سے اس کے قوائے عملیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جدّوجہد اور سعی و کاوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے. عافیت کوشی اور سہل انگاری سے، کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں، ان کی قوتِ برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر جھلا اٹھتے ہیں. محکومیت کا زہر کس قدر میٹھا، خواب آور اور چپکے چپکے غیر محسوس طور پر موت کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے. یہی زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر ذرّہ میں سرایت کر چکا تھا اور انہیں ذرا سی تکلیف پر اس کا دلی افسوس ہوتا تھا کہ ہم مصر کی محکومیت سے کیوں آزاد ہو گئے؟ چنانچہ تورات میں دوسری جگہ ہے:۔

> پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے۔ اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرہویں دن سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے، پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس میدان میں موسیٰ اور ہارون پر جھنجلائی اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش! ہم خدا کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں، جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے، مارے جاتے کیونکہ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۳-۱۶/۱)

آپ نے دیکھا کہ انہیں کس چیز کی یاد ستا رہی تھی؟ "گوشت کی ہانڈیوں کی"، یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا للعجب!! سحرِ حکمرانی کس قدر ذہنیت مسخ کر دیتا ہے کہ اس سے دیدۂ شاہین میں نگۂ خفاش رکھ دی جاتی ہے جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمرِ بہشت بنا کر دکھاتی ہے. یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی. وہ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی، تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

> تب بنی اسرائیل کی جماعت نے قیدیم میں ڈیرہ ڈالا. وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پئیں. موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے. سو لوگ موسیٰؑ پر جھنجلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہمارے مویشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔ (خروج ۳-۱۷/۱)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر رُوٹھ جاتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟ قرآن کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو اس لئے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور مختلف مقامات پر اسے بار بار

سامنے لاتا ہے کہ اس کے اندر ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں چنانچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وہ موہبت و نعمت جو انہیں بلا محنت و مشقت مل گئی تھی کس طرح ان کے لئے وبالِ جان اور بلائے بے درمان بن رہی تھی۔

بخود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقامِ آذری کردہ

انہیں مصر کی لعنتی زندگی سے نکال کر سینا کے میدانوں میں اس لئے لایا گیا کہ وہ اپنے جوہرِ خودی کی تربیت کریں اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کر لیں جس سے مصافِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ ہو سکے اور یوں اپنے پیکرِ خاکی کے ذرّاتِ کہن کو ترتیبِ نو دے کر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کریں جو وراثتِ ارض کی قرارگاہ پائے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا کی وادیوں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بُت کی پوجا کر رہے ہیں۔ یہ حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بُت بنوا دیجئے! قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ط (۷/۱۳۸) حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰؑ چند روز کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انہوں نے گئوسالہ سامری کی پرستش شروع کر دی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو، کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں، تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵) ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں۔ وادیٔ ایمن میں صحرا کی صاف و سادہ غذا مائدہ فطرت پر کھانے کو ملتی تھی، لیکن انہیں رہ رہ کر شہر کے چٹپٹے کھانوں کی یاد ستاتی تھی۔ چند روز کے بعد مُنہ بسور کر بیٹھ گئے، لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ (۲/۶۱) ”ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جائے گی۔“

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور ان کے جوہرِ مردانگی مسلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے۔ بات بات پر منطقی موشگافیاں، قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آرائیاں، زندہ قوموں کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا سُنا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ وہ کام زیادہ کرتے ہیں اور باتیں بہت کم لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے۔ کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ ایک گائے (یا سانڈ) ذبح

کرلو. کس قدر صاف اور سیدھی بات تھی. لیکن سورۃ بقرہ کو اٹھا کر دیکھئے' انہوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں اور کس طرح بال کی کھال نکالنی شروع کی ہے. یہ ہوتی ہے محکوم کی ذہنیت!

○

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' مصر سے خروج بنی اسرائیل کے لئے مقصود بالذات نہ تھا. فرعون کی محکومیت سے رستگاری اس مقصد کے لئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صالحیت کے جوہر پیدا کرلے تاکہ ارضِ مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آجائے. حضرت موسیٰؑ انہیں سرزمینِ فلسطین کے کنارے تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھ دی ہے. اٹھو اور اس پر قبضہ کرلو.

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○ (۵/۲۱)

لوگو! اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے عزم و ہمت کے ساتھ) داخل ہوجاؤ اور الٹے پاؤں پیچھے کی طرف نہ ہٹو (کہ کامیاب ہونے کے بجائے) نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے.

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا. سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا رہا تھا. فریقِ مقابل کے آدمی انہیں دیو نظر آتے تھے. انہوں نے جواب دیا.

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ○ (۵/۲۲)

لوگوں نے اس کے جواب میں کہا. اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں (ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں). جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے. ہاں اگر وہ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہوجائیں گے.

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریقِ مقابل از خود وہاں سے نکل جائے تو پھر ہم آگے بڑھیں گے! حضرت موسیٰؑ نے بہتیرا سمجھایا، لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہوسکتا تھا؟

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (۵/۲۴)

وہ بولے اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی مصر ہو تو) تم خود چلے جاؤ اور تمہارا[1] خدا بھی تمہارے ساتھ چلا جائے۔ تم دونوں وہاں اُن کے ساتھ لڑنا (جب تمہاری فتح ہو جائے ہمیں آواز دے دینا) ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

لیجئے! جواب مل گیا کہ ہماری بہبود کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے ان لوگوں سے لڑیے اور اپنے ساتھ (معاذ اللہ) اپنے اس خدا کو بھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔ جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا ہم پہنچ جائیں گے۔ اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلام کی؟
اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ بلا محنت و مشقت وراثتِ ارض کے مستحق ہو گئے؟ کیا انہیں وہ سرزمین یونہی اتفاقاً مل گئی؟ بالکل نہیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۗ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ (جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ یہ اسی بیاباں میں سرگرداں رہیں گے۔ سو اے موسیٰ تم ان نافرمان لوگوں کے اس مآل پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے اس لئے وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھراتے رہے تاکہ اس افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے اور جب ان کی نئی نسل جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے الگ کر کے کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو اور وہ اپنے اندر اس صالحیت کو پیدا کر لے جو وراثتِ ارض کے لئے شرط ہے تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اس نئی پود نے اپنے اندر صالحیت

---

[1] ابّ کے معنی بڑے بھائی کے بھی ہیں۔

پیدا کرلی تو وہ ایک ہی جست میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے۔

كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۵۹)

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا اور اس طرح تیرے اللہ کی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت اور استقامت سے جمے رہے تھے۔

یہ وراثت، صالحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صالحیت، جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو قرآن نے "ایقان و صبر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۫ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ۝ (۳۲/۲۴)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے اور یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے ثبات و استقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر محکم یقین رکھتے تھے۔

بنگویشتن نگر

یہ ہیں داستانِ بنی اسرائیل کے وہ اجزاء جو ہمارے موضوع زیرِ نظر سے براہِ راست متعلق ہیں۔ اس میں استخلاف فی الارض (وراثتِ زمین) کے سلسلے کی دو متمیز کڑیاں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جسے ابتدائی حصّہ کہنا چاہیئے۔ جس میں غیروں کی محکومیت سے اس لئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود و ارتقاء کے لئے امکانی مواقع مل جائیں۔

---

[1] داستانِ بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت و موعظت کے ہزار سامان رکھتی ہے اور ہمارے حالات پر تو یہ اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ جو باریک بین نگاہ اسے دیکھے گی، بیساختہ پکار اٹھے گی کہ ـــــ "ارے دل یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے"۔ ـــــ اس داستان کی تفاصیل "برقِ طور" میں ملیں گی۔

اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صالحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم وراثتِ ارض کی مستحق قرار پا جائے۔ حصولِ صالحیت کا ابتدائی مرحلہ ہو یا استخلاف و وراثت کا ثانوی حصہ، دونوں میں مواقع اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت و اختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھ لیا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر حکومت کی صلاحیت پیدا کرتی ہے یا نہیں۔ اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور پر کرتی ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیرِ حکومت تھی کہا وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝ (۷/۱۲۹) قریب ہے کہ اللہ تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر دے پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔" اور قومِ محمدؐ رسول اللہ سے کہا گیا کہ

> وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝ (۱۰/۱۳-۱۴)
>
> اور یقیناً (ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے) تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا۔ جب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ (جادۂ عدل و انصاف سے ہٹ کر) ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ) ان کے رسولؑ ان کے پاس واضح حقائق لے کر بھی آئے لیکن بایں ہمہ ایسا نہ ہوا کہ وہ ایمان لے آتے۔ اس طرح ہم مجرم اقوام کو سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

لہٰذا امکانی مواقع، یا قوت و اختیار کے خزائے اس لئے ملتے ہیں۔ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ تاکہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

○

ہماری حالت

ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آئیے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں بغیر صلاحیت کے مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے اندر قطعاً وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا

کرتی ہیں. کیا عوام اور کیا خواص، ہم سب اسی سطح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے. صالحیت تو بڑی چیز ہے، ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی قوتوں کی بنا پر حصولِ مملکت و سلطنت کے لئے زندہ رہنے کی متمنی قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہے. ان قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جنہوں نے اپنے اغراض و منافع اور ذاتی مقاصد و مطامع کی خاطر دوسروں کے نظامِ سلطنت سے رستگاری حاصل کرنے، یا اپنے تصورات کے مطابق بساطِ حکومت بچھانے کے لئے جدّوجہد کی، اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں انہیں کیا کیا مصائب برداشت کرنے پڑے اور انہوں نے ان سب شدائد و نوائب کا کس پامردی و استقامت، حوصلہ اور ہمت، عزم و استقلال سے مقابلہ کیا. اور اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر کس طرح مستانہ و جانفروشانہ انداز سے ہر مخالف قوت کی صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے. ابھی کل کی جنگِ عمومی کو دیکھئے. محض ملکی حفاظت اور قومی اجارہ داریوں کی حصارت کے لئے مختلف اقوامِ مغرب نے کس کس ایثار و قربانی سے نامساعدتِ حالات کا مقابلہ کیا. ان سب حقائق کو سامنے رکھئے اور ——— باز بخویشتن نگر ——— یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہم میں فی الواقع عام قومی خصائص بھی پیدا نہیں ہوئے، چہ جائیکہ ہمارے اندر صفاتِ الٰہیہ منعکس ہوں اور ہم صبغۃ اللہ کے مشہود پیکر دکھائی دیں.

با آدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی!

گذشتہ ابتلاء وانتشار (یعنی تقسیمِ ہند کے قیامت خیز حوادث) میں ہم نے ایک طرف جس عدمِ تدبّر اور افلاسِ نظر اور دوسری طرف جس فقدانِ ضبط و استقامت اور حرمانِ عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا ہے ——— نہیں! اس سے بھی آگے بڑھئے. ہم نے ایک طرف جن کفن دزدیوں اور مردار خوریوں، جن یوسف فروشیوں اور "یعقوب فریبیوں"، اور دوسری طرف جن افراتفریوں اور نفسانفسیوں، جن ضابطہ شکنیوں اور آئین فراموشیوں کا ثبوت دیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادتیں ہیں کہ ہم اس وقت زندہ قوموں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل اور حکومت و مملکت کے مستحق کہلانے کے اہل قطعاً نہیں. لہٰذا غیروں کی حکومت سے نجات اور اس خطۂ زمین کی موہبت محض انعاماً و احساناً ہوئی ہے جس طرح بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی سے رہائی اور سینا کی وادیوں میں پرچم کشائی محض اعزازاً و اکراماً ہو گئی تھی. اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا اسباب و ذرائع پیدا کئے گئے اور احوال و ظروف کس طرح ایک خاص نہج و ترتیب پر متشکل ہوتے چلے گئے، یہ ایک الگ بحث ہے. حقیقت یہی ہے (جو اس وقت ہمارے سامنے ہے) کہ یہ

نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں، ہماری استعداد و اہلیت کا ماحصل اور ہماری سعی و کاوش کا ثمرہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں بلامزدو معاوضہ اور بلا محنت و مشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے ہیں۔ اور ملے اس لئے ہیں لننظر کیف تعملون (تاکہ دیکھا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔ غیروں کی حکومت میں ہمیں وہ مواقع حاصل نہیں ہوسکتے تھے جو اس صالحت کو پیدا کرسکیں جو وراثتِ ارض کے لئے بنیادی شرط ہے۔ یہ خطہ زمین انہی مواقع (OPPORTUNITIES) کو بہم پہنچانے کے لئے عطا ہوا ہے۔ یہ کھلا میدان اس لئے دیا گیا ہے کہ لننظر کیف تعملون (تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔

○

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، صالحیت مشروط ہوتی ہے ایمان اور عملِ صالح سے۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ٥

(۲۹/۹)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو یقیناً صالحین کے زمرہ میں شامل کریں گے۔

ایمان کے معنی ہیں زندگی کا متعین نصب العین، منتہائے نگاہ، مطمحِ نظر، منزلِ مقصود، اور اس نصب العین کے برسرِ حق ہونے پر یقینِ محکم۔ اور اعمالِ صالح کے معنی ہیں ایسا عملی پروگرام جو اس نصب العین کے حصول کے لئے ضروری صلاحیتیں پیدا کردے اور جس سے معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں۔

اس حقیقت کو قرآن نے واضح کردیا ہے کہ ایک برسرِ حق نصب العین کے حصول کی راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی روش ہے۔ اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا۔ مومن وہی ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے۔ جو اس راہ میں تکالیف سے جی چراتے وہ مومن نہیں۔ قرآن کی رُو سے منافق ہے۔ چنانچہ آیہ مندرجہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ٥

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○ (۲۹/۱۰-۱۱)

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ (کی راہ) میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح و کامرانی کے وقت) پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اللہ نہیں جانتا جو اہلِ جہان کے سینوں میں ہے (ضرور جانتا ہے)۔ اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھ لے گا اور منافقین کو بھی۔

لہٰذا صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار جس کے متعلق فرمایا۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (۶۳/۱۰)

اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اسے اس کے نظام کے قیام کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اس وقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ یہ اذیتیں اور مشقتیں مخالفین کے مقابلہ سے پیدا ہوں گی۔ یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی۔ ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس امکانی قدرت کو بھی گوارا نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطۂ زمین پر خدا کے قانون کے مطابق حکومت متمکن ہو گئی تو ان کا باطل آگیں نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ باطل اپنی بنیادی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتا ہے' اس لئے وہ ہمیشہ نظامِ حق و صداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی و کاوش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

مخالفت

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکّارانہ سازشوں اور جارحانہ منصوبوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا' اس لئے کہ اگر ان کی کمزوری یا لاپرواہی سے خدانہ کردہ ان کے مشئوم عزائم بروئے کار آگئے تو یہ امکانی قدرت' جسے صالحیت یعنی وراثتِ

ارضی کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے، یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور کس قدر سوختہ ساماں اور شوریدہ بخت ہے وہ قوم جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا اس طرح سے چھن جائے!

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے
ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اس لئے خائف ہوں گے کہ اس میں انہیں اپنی ملمع کارانہ سیادت اور ابلہ فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی۔ یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ہر دعوتِ انقلاب حق و صداقت کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے، اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین کے عناصرِ ترکیبی، ان کے نفسیاتی میلانات اور ذہنی رجحانات، ان کے خصائص و لوازم، ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں، یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سرِ دست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ "مترف" کے مفہوم میں، تن آسان، سہل انگار، نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی، سب داخل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (۳۴/۳۴)

ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے پیغام صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

ہر داعئ حق و صداقت کا پیغام انقلاب آفریں و حریت بخش ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کو اُلٹ کر ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام کے تمکن میں ان مترفین کو، جو پشتہا پشت سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں، اپنے لئے پیغامِ موت نظر آتا ہے، اس لئے کہ ان کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انھیں کسی تبدیلئ حالات کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ بنا بریں، ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظامِ معاشرت و تمدن چلا آ رہا ہے اسی پر چلتا جائے۔

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۳)

اور اس طرح ہم نے (اے رسولِ عربی) تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا کہ اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہے اسی کی تقلید میں ہم (نجات وسعادت کی راہ دیکھتے) ہیں۔

یہی وہ قوم کے اکابر ہیں جو ہر دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز اٹھاتے ہیں' اس لئے کہ انہوں نے اپنی ساحرانہ فسوں طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیوں سے قوم کو سکھایا ہی یہ ہوتا ہے کہ تم مرو تاکہ ہم زندہ رہیں' تم کماؤ تاکہ ہم تن آسانی کی زندگی بسر کریں' تم دکھ جھیلو تاکہ ہم سکھ اٹھائیں۔ تم سنو تو ہمارے کانوں سے' دیکھو تو ہماری آنکھوں سے' سوچو تو ہمارے دماغوں سے' سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ سے۔ چراغ تمہارے ہوں راتیں ہماری' زبان تمہاری ہو باتیں ہماری۔ تمہارے پسینے سے ہمارے گلستانوں میں آبیاریاں ہوں اور تمہارے خون کی رنگینی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں۔ اس لئے ہر وہ تبدیلی جس میں سرِ بخاک غریب کے لئے سامانِ زیست میسر ہو' ان کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ازل سے ہوتا آرہا ہے' یہی ابد تک ہوتا رہے گا۔ آج سے پانچ ہزار سال

مترفین کا گروہ

پیشتر جب صحنِ زمین میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز' حضرت نوحؑ کی زبان سے اٹھی' تو انہی اکابر نے اس کی مخالفت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۷/۶۰)

اس کی قوم کے اکابر نے کہا کہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو (اس دعوتِ انقلاب میں) ایک کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اسی پیغام کو جب حضرت ہودؑ نے دہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اسی دعوت کی مزاحمت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۷/۶۶)

اس کی قوم کے اکابر نے جنہوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا کہا کہ ہم سمجھتے ہیں
کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

یہی وہ اکابرین قوم تھے جنہوں نے حضرت صالحؑ کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۷/۷۶)

اس قوم کے متکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا (۷/۸۲) اور اسی نہج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا۔ یہی وہ اکابر و جبابرۂ قوم تھے جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی' اور یہی قومِ فرعون کے وہ متکبرین و مترفین تھے جنہوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنہوں نے جناب مسیحؑ کو حوالۂ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی' اس لئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے' اور یہی وہ رؤسا و امراءِ عرب تھے جنہوں نے تمام عمر اس دعوتِ آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقین کو دینے کے لئے بلند ہوئی تھی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہوگا۔ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں' جب اس انقلابِ صحیحہ کی آواز اُٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امارت کے پیمانے بدل جائیں گے' تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز انہی مترفین کی طرف سے ہوگی جو آج اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب الاحترام بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۹) وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ محض زبان سے کہتے ہیں لیکن) کرتے نہیں ان کے لئے ان کی تعریف کی جائے انہیں مستقلاً مسانیدِ عظمت و منابر عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظامِ نَو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی۔ چونکہ اس زمانہ کی فضا میں عہدِ کہن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے سیاستِ حاضرہ کے تقاضے یہ ہیں کہ زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود ہو۔ یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں۔ لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

فلہذا پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انہوں نے اس باب میں جرأت و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ یہ بھی اس قسم کی حکومت قائم کرلیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہرحال و بہرکیف غیروں کی حکومت کے مقابلہ میں ہزار آئین سودمند ہوتی ہے، اس لئے وہ زندگی اس سے پیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہوگی۔ لیکن قرآنی زندگی نہ یہ پہلے تھی نہ یہ دوسری ہوگی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع میسر نہیں تھے جن سے ہم اپنے تصوراتِ صحیحہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کر سکتے۔ لیکن اب امکانی قدرت کے میسر آجانے سے وہ عذر باقی نہیں رہا۔ اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پر استوار کیوں نہ کیا؟ قرآنی نقطۂ نگاہ سے حکومت مبدّل بہ استخلاف و "وراثت" اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کے لئے تجویز کیا ہے اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)

یہ (صالحین) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور نواہی سے روکیں گے۔ اور تمام امور کا آخری فیصلہ خدا کے قوانین کے مطابق ہوگا۔

نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسی محیطِ کل اور ہمہ گیر اصطلاحات ہیں جن میں سے ہر ایک، تبیین و تشریح اور تفصیل و توضیح کے لئے مستقل ابواب کی محتاج ہے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآنی نظام کی پوری کی پوری بساطِ حکومت انہی چار گوشوں کے اندر سمٹ کر آگئی ہے۔ نظامِ صلوٰۃ ان میں عمودی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے درحقیقت وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے جو تمام نوعِ انسانی

کی ربوبیت کا کفیل اور عالمگیر نشوونما کا ضامن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر قرآن کے نظامِ صلوٰۃ کے ضائع ہو جانے کو نعمائے الٰہیہ کے چھن جانے کا موجب قرار دیا ہے۔ سورۂ مریم میں دیکھئے، منعم علیہ حضرات (علیہم التحیہ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ کے بعد فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنی خواہشات ہی کا اتباع کرنے لگ گئے۔ سو وہ ہلاکت اور بربادی کو پالیں گے۔

یہی ہیں وہ جن سے استخلاف فی الارض کی سی نعمت چھن جاتی ہے۔ اور کیسے سوختہ بخت ہیں وہ لوگ جن سے ایسی متاعِ عزیز اس طرح چھن جائے؟ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔

○

یہ ہے صالحیت پیدا کرنے کا نظام جس کا فطری نتیجہ وراثتِ ارض ہوتا ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھئے اور پھر ایک نگاہ اپنے اوپر ڈالئے اور ایسا کرتے وقت بنی اسرائیل کی اس واژگوں بخت قوم پر بھی نگاہ ڈالئے جس کے مقدرات کے ڈوبتے ہوئے ستارے ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی اور وہ لگے بڑبڑانے۔ کوئی بات خلافِ منشا پیش آگئی اور وہ بیٹھ گئے مُنہ بسور کر۔ قدم قدم پر یہ طعن کہ ہمیں خواہ مخواہ مصر سے نکال کر لے آئے۔ اس سے تو ہم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے۔ اور یہاں کیا حالت ہے؟ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے "پاکستان مُردہ باد" کے نعرے لگاتے جلوس کی شکل میں چلے جا رہے تھے۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگا "میاں! تین دن ہو گئے پانی کا نل بند پڑا ہے، کوئی سنتا ہی نہیں۔ جہنم میں گیا ایسا پاکستان اور بھاڑ میں گئی اسلامی حکومت، کچھ وہاں مر گئے، اور جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں۔" دیکھئے یہ داستان کس طرح حرفاً حرفاً بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذرعاً ذرعاً اور شبراً شبراً ان کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ جس شخص سے بات کیجئے ایسا معلوم ہوگا گویا اس نے پاکستان میں آکر کسی کی ہفت پشت مفتادنسل پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ان مصیبتوں کی برداشت میں ان کی طرف سے کچھ اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا

ہے گویا یہ مصیبتیں کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں. انہیں قطعاً اس کا احساس نہیں کہ انہیں ایک ملکِ عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں' اور اگر انہوں نے ان مصائب اور تکالیف کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں ان کے قدم چومیں گی. یہ عوام کا حال ہے. خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے. اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا. ہندوؤں کی یہ چند روزہ غوغا آرائی ختم ہو جائے تو وہ تختِ جہانداری و سریرِ جہانبانی پر کامل امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے. وذالک الفوز العظیم.

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دُعا کے بعد

یاد رکھئے! یہ خطۂ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں. نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں. یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں' اور پھر اس طرح محفوظ و مصؤن ہونے کے بعد یہ جنتِ ارضی میں اسی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تختِ اجلال بچھائیں. یہی وراثتِ ارض کا ابدی قانونِ صالحیت ہے' اور خوف و حزن سے مامونیت و مصؤنیت صرف اس کے لئے مقدر کی گئی ہے جو قانونِ الٰہیہ کی نگہداشت کرے اور اس طرح اصلح بن جائے.

فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ‏(۷/۳۵)

پس جو کوئی (قوانینِ خداوندی کی) نگہداشت کرے اور اپنے اندر صالحیت پیدا کر لے اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم.

وَذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ.

قرآن اور تاریخ

(نوشتہ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

دنیائے انسانیت میں جو اہمیت تاریخ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر و بصیرت سے پوشیدہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا امتیازی نشان تاریخ ہے۔ حیوانات کی حالت یہ ہے کہ وہ ہزارہا سال گزرنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہوتے ہیں جہاں ان کی نوع کا پہلا حیوان تھا (مثلاً) جو ہرن آج ہمارے سامنے آتا ہے وہ انہی صلاحیتوں اور خاصیتوں کا حامل ہوتا ہے جو دس ہزار سال پہلے کے ہرن میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن (اس کے برعکس) آج کا انسان، (صلاحیتوں اور خاصیتوں، نیز احوال و ظروف کے اعتبار سے) دس ہزار سال پہلے کے انسان سے یکسر مختلف ہے۔ دس ہزار سال پہلے کا انسان آگ تک جلانا نہیں جانتا تھا۔ اسے گھر بنانا نہیں آتا تھا۔ اس کے پاس نہ کسی قسم کے اوزار اور ہتھیار تھے، نہ آلات و ادوات۔ اس کی زندگی قریب قریب حیوانات کی سی زندگی تھی۔ لیکن آج کا انسان چاند تک پہنچنے کی فکر میں ہے۔ آج ہمارے بچے اتنا کچھ جانتے ہیں جتنا آج سے سو سال پہلے کے عالم نہیں جانتے تھے۔ سو سال تو ایک طرف جو باتیں ہمارے بچپن میں طلسم ہوش ربا کے افسانے اور الہ دین کا چراغ معلوم ہوا کرتی تھیں، وہ آج روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں۔ انسان کی یہ ترقی کس بنا پر ہے؟ محض اس بنا پر کہ ایک نسل یا ایک زمانہ کا انسان اپنے تجربات اور مشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (اور حیوانات میں یہ صلاحیت نہیں) اسی کو تاریخ کہتے ہیں۔ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زمانہ اپنے ارتقائی منازل اسی کے سہارے طے کرتا آ رہا ہے۔ تہذیب و تمدن کی متاعِ گراں اور علم و ہنر کی شمع فروزاں جب اور جہاں نظر آئے گی تاریخ ہی کی رہینِ منت ہوگی۔ تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا ماحصل۔ ہزارہا سال کی

تاریخ کیا ہے؟

مسلسل تگ و تاز کا نچوڑ۔ اقوام و ملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ انسان کے قلب و دماغ کی کاوشوں کا سیلِ رواں جو اپنے سرچشمہ کے قریب ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا حدود فراموش ہوتا گیا۔

خارجی مشاہدات و تجربات سے ہٹ کر انسانی معاشرہ کی طرف آیئے تو اقبالؒ کے الفاظ میں، ایک قوم کے لئے تاریخ کی حیثیت وہی ہے جو ایک فرد کے لئے حافظہ کی ہے۔ اگر کسی فرد کا حافظہ گم ہو جائے تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے تو خود اس قوم کا وجود بہ حیثیت قوم ختم ہو جاتا ہے۔ قومیں اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے آگے بڑھتی ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اپنے تاریخی سرمایہ، یعنی ماضی سے مسلسل چلے آنے والے اور بڑھتے رہنے والے اندوختہ سے جو اس قدر فیضیاب ہوتا ہے تو کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ

تاریخ کی افادیت کا راز

کائنات میں خدا کے غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں اس لئے جس بات کا جو نتیجہ آج سے ہزار سال پہلے برآمد ہوتا تھا، وہی بات اگر آج دہرائی جائے گی تو اس کا وہی نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔ آج سے (مثلاً) پانچ ہزار سال پہلے کے انسان نے دیکھا کہ جو شخص سنکھیا کھا لیتا ہے، مر جاتا ہے۔ اس نے اس تجربہ (یا مشاہدہ) کو آگے منتقل کر دیا۔ لہٰذا ہم حتم و یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر آج بھی کوئی شخص سنکھیا کھائے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

پھر، جو کیفیت طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کی ہے، وہی ان قوانین کی ہے جن کا تعلق انسان کی حیاتِ اجتماعیہ سے ہے۔ جن قوانین کی خلاف ورزی سے آج سے دو ہزار سال پہلے کی قومیں تباہ و برباد ہوتی تھیں، ان سے رُوگردانی کا نتیجہ آج بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جن قوانین کی اتباع سے اس زمانے میں زندگی اور توانائی ملتی تھی ان سے متمسک رہنے کا نتیجہ آج بھی سربلندی و سرفراز ہوگا۔

یہ کلیہ کہ جو عمل ایک دفعہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس سے ہر بار ویسا ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے، سائنس کہلاتا ہے۔ آج ہم تاریخ کی سائنس (SCIENCE OF HISTORY) یا تاریخ بہ حیثیت سائنس، کے الفاظ عام طور پر سنتے ہیں۔ لیکن دنیا میں سب سے پہلے جس نے تاریخ کو اس حیثیت سے پیش کیا، وہ قرآن تھا۔ قرآن سے پہلے، اوّل تو تاریخ مرتب کرنے کا عام رواج ہی نہ تھا۔ مورخین یونہی

کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ پھر ان کے نزدیک تاریخ سے مقصود وقائع نگاری (یعنی واقعات و حوادثات کو اکٹھا کر دینے) سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ تاریخ کو بحیثیت ایک سائنس کے پہلی مرتبہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور ایک تاریخ ہی پر کیا منحصر ہے۔ قرآن نے اپنے ہر دعوے کو سائنس کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ کالرج نے کہا ہے کہ شاعری (POETRY) کی بدِ مقابل (ANTI-THESIS) نثر (PROSE) نہیں سائنس

سائنس آف ہسٹری

ہے۔ قرآن نے جب اپنے متعلق کہا ہے کہ میرے ہاں شاعری نہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہے۔ شعر میں نہیں لکھی گئی۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کا ہر دعوےٰ سائنس کے اصولوں پر پورا اُترے گا، یونہی شاعرانہ ادعا ثابت نہیں ہوگا۔ بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن، تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ہم نے تمہاری طرف اپنے واضح قوانین نازل کئے اور ان قوانین کے ساتھ وَ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ۔ اقوامِ سابقہ کے حالات نازل کئے وَ مَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ o (۲۴/۳۴) یعنی ان لوگوں کے لئے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہیں، سامانِ عبرت و موعظت۔ یعنی خدا کے غیر متبدل قوانین جنہیں نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا ہے، اور ان کے ساتھ تاریخی امثال و نظائر، دونوں منزّل من اللہ ہیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگالیا کہ قرآن کی رُو سے اقوامِ سابقہ کی تاریخ کی اہمیت کیا ہے؛ قرآن میں امم گذشتہ کے احوال وظروف کا

قرآن اور تاریخ کا مطالعہ

تذکرہ جو اس شدت و تکرار سے آیا ہے تو اس سے مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اُس ضابطۂ ہدایت کی زندہ شہادات ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور جن کی خلاف ورزی سے قومیں ہلاکت اور تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ حجر میں ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ اکثر و بیشتر

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ

سنے ہوں گے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔" (HISTORY REPEATS ITSELF) اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ کے واقعات اسی شکل و صورت میں بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ بار بار اس

حقیقت کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ فلاں اندازِ زندگی کا نتیجہ فلاں قسم کا ہوگا اور فلاں روش کے عواقب فلاں نوعیت کے۔ تاریخ کے اپنے آپ کو اس طرح دُہرانے کا تصور بھی پہلے پہل قرآن نے پیش کیا۔ سورۃ حجر میں اقوامِ سابقہ کا تذکرہ اسی زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷)۔ مَثَانِي کے معنی ہیں وہ چیز جو بار بار دہرائی جائے۔ یعنی تاریخی شواہد۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ، ہم نے تجھے ایک تو زندگی کے وہ بنیادی اصول دیئے جن کے مطابق اعمالِ حیات اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور دوسرے وہ متعدد تاریخی واقعات جو اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ان قوانین سے فی الواقعہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

یہ تاریخی نظائر اس لئے دیئے ہیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روش اختیار کی تو اس کا انجام کیا ہوا۔ سورۃ مومن میں ہے اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کیا یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ اس میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ، لائبریریوں کے اندر کتابیں پڑھنے ہی سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کا طالب علم، ان قوموں کے دیار و امصار میں جائے اور ان کے اُجڑے ہوئے کاشانوں کے کھنڈرات سے ان کے عروج و زوال کی داستانیں مرتب کرے۔

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ

بہرحال، مندرجہ بالا آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اگر کوئی قوم کسی طرح دولت اور قوت جمع کرلے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہو تو اسے زوال نہیں آسکتا۔ وہ انہی مادی ذرائع کے بل بوتے پر زندہ و پائندہ اور صاحبِ غلبہ و اقتدار رہ سکتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے قوموں کی زندگی اور استحکام کے لئے صرف اسباب و علل کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس قوم کو اُن اصولوں کا حامل بھی ہونا چاہیئے جن کے مطابق معاشرہ قائم کرنے سے استحکام اور بقا حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جن اقوامِ سابقہ کی طرف قرآن نے مذکورہ صدر آیت کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق کہا کہ وہ تعداد کے لحاظ سے بھی اس قومِ مخاطب سے زیادہ تھے۔ اور طاقت اور زمینی استحکامات میں بھی ان سے بڑھ کر۔ لیکن اس کے باوجود فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ ان کا

کسب و ہنر جس پر انہیں اس قدر ناز تھا' ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن عواقب سے انہیں بالکل نہ بچا سکا۔ وہ ان کے کسی کام بھی نہ آیا۔ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ ان کے پاس فرستادگانِ خداوندی صحیح اور واضح ضابطۂ حیات لے کر آئے لیکن وہ اپنے خود ساختہ آئین وضوابط ہی پر نازاں رہے اور جس روشِ زندگی کی طرف وہ رسول دعوت دیتے تھے اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ ان کی غلط روش' خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق (جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے) تباہ کن نتائج مرتب کرتی رہی۔ لیکن یہ کچھ غیر محسوس طور پر ہو رہا تھا۔ اور اسی لئے وہ' باوجود سخت تنبیہ اور تاکید کے اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جو ان سے کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کے نتائج تمہیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہے ہیں تو یہ محض ڈراوا ہی ڈراوا ہے۔ لیکن اس کے بعد (جب یہ عبوری وقفہ ختم ہوا اور) ان کے غلط معاشرے کے تباہ کن نتائج محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ تو اس وقت وہ پکار اٹھے کہ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا کے قوانین واقعی سچے ہیں۔

اس مقام پر فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا کہا ہے۔ یعنی انہوں نے جب ہمارے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دوسری جگہ کہا ہے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (٢١/١٥-١١) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھ لیا۔

تباہی کا احساس

اس سے ظاہر ہے کہ وہ عذاب اس سے بہت پہلے سے متشکل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن پہلے وہ غیر محسوس اور غیر مرئی منازل میں تھا۔ اس کے بعد وہ محسوس و مرئی شکل میں سامنے آگیا۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ وقفہ درحقیقت اُس عبوری دَور کا نام ہے جس میں اعمال کے تباہ کن نتائج وجود کوش ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہنوز محسوس پیکر میں سامنے نہیں آتے۔ اسی کو عام الفاظ میں مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔ یعنی اس وقفہ میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ اگر وہ قوم اپنی روش درست کر لے تو اس کی صحیح روش کے زندگی بخش نتائج' سابقہ روش کے تباہ کن عواقب کے اثر کو زائل کر دیں۔ لیکن جب ہلاکت محسوس شکل میں سامنے آجائے تو اس وقت اس حقیقت کا اقرار کہ خدا کے قوانین سچے تھے کچھ فائدہ نہیں دیتا فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ جب سنکھیا' ان کے جسم کی وریدیں اور شریانیں پھاڑے۔ اور زندگی کے خلیات (LIFE CELLS) کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو اس وقت اس امر کا اعتراف کہ ڈاکٹر کا کہنا ٹھیک تھا کہ سنکھیا

تمہیں مار دے گا زندگی واپس نہیں لا سکتا۔

سُنَّتِ اللہ یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ یہ بات یونہی اتفاقی طور پر (BY CHANCE) نہیں ہوگئی۔ یہ ہمارا قانون ہے جو اقوامِ عالم میں اسی طرح چلا آرہا ہے اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۸۵-۸۲/۴۰) جس قوم نے بھی اس کی صداقت سے انکار کیا وہ تباہ و برباد ہوگئی۔

غور کیجئے۔ قرآن نے اسے سنتہ اللہ کہا ہے۔ یعنی خدا کا قانون۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے تاریخ کا مطالعہ درحقیقت سنتہ اللہ کا مطالعہ ہے جو شروع سے آخر تک ایک ہی نہج سے چلی جائے گی۔ اس میں کبھی اور کہیں تبدیلی نہیں ہوگی سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۶۲/۳۳) خدا کا یہی قانون تھا جو ان لوگوں میں جاری و ساری تھا جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں (اور یہی قانون اب ان لوگوں میں جاری ہوگا) اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوسری جگہ ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ (۴۳/۳۵) اس قانونِ خداوندی کے نتائج و عواقب میں تبدیلی تو ایک طرف تم اس کے رُخ اور سمت میں بھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ خدا کا قانون آندھی کا جھکڑ یا دریا کا سیلاب نہیں کہ جدھر جی میں آیا رُخ کر لیا۔ یہ ٹھیک اسی سمت میں جائے گا جس طرف اسے جانا چاہیئے۔

یہ سنت اللہ یا قانونِ خداوندی کیا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی یا استثناء نہیں ہوتی؟ اس کے متعلق قرآن نے مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے تفاصیل دی ہیں۔ لیکن ان تفاصیل کا ملخص یہ ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ حق کے معنی

کشمکشِ حق و باطل ہیں خدا کے وہ محکم اصولِ زندگی جن کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے اور جو کائنات اور انسان کی نشوونما کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں باطل کے معنی ہیں وہ تمام غیر خداوندی قوانین و ضوابط جو کائناتی اور انسانی نشوونما کے راستے میں حائل ہوتے ہیں اور جن کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوتا ہے۔ لہٰذا کائنات میں ایک کشمکش پیہم جاری ہے جس میں حق اور باطل برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ کہ کبھی اتفاق سے حق غالب آگیا۔ اور کبھی باطل کامیاب ہوگیا؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ فَيَدْمَغُهٗ۔ حق باطل کا سر توڑ کر رکھ دیتا ہے فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)

سو دیکھو کہ وہ کس طرح نیست و نابود ہو جاتا ہے یہ اس لئے کہ خدا نے کائنات کا یہ سلسلۂ عظیم یونہی کھیل اور مذاق کے طور پر پیدا نہیں کر دیا کہ اس میں کبھی کچھ ہو جائے کبھی کچھ (۲۱/۱۶) کائنات کا ذرہ ذرہ اس مقصدِ جلیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا رہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝ (۵۳/۳۱) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے اللہ کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہے۔ تاکہ ناہمواریاں پیدا کرنے والے کاموں کا نتیجہ انہی کے مطابق مرتب ہو اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے کا نتیجہ حسین و خوشگوار ہو۔

قانونِ مکافات

دوسرے مقام پر ہے اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (۱۰/۴) اس نے کائنات کے سلسلہ تخلیق کی ابتدا کی ہے۔ اور پھر وہ اسے گردشیں دیتا رہتا ہے تاکہ وہ لوگ جو اس کے قانون کو سچا مان کر صلاحیت بخش کام کریں، انہیں حق و انصاف سے پورا پورا بدلہ ملتا رہے۔ اسی طرح سورۂ سبا میں ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا ایک ایک ذرہ خدا کے سامنے ہے اور اس کے قانون کے مطابق مصروفِ تگ و تاز ہے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۳۴/۴) تاکہ وہ ایمان و عملِ صالحہ کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیتا رہے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ کوئی قوم غلط روشِ زندگی اختیار کرے اور اس کا نتیجہ زندگی کی مرفہ الحالیاں اور سرفرازیاں ہوں۔ اور کوئی قوم صحیح ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

○

ہمارے زمانہ میں تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے (مشہور فلاسفر) ہیگل نے پیش کیا اور اسی نظریہ پر بعد میں مارکس نے اپنے معاشی نظام کی عمارت اٹھائی۔ لیکن ہیگل کے تصور اور قرآن کے پیش کردہ اصول میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ ہیگل کا نظریہ ہے کہ دنیا میں ایک تصور (IDIA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کی فضا میں بڑھتا، پھولتا اور پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ عین شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اسی کے اندر سے ایک اور تصور ابھرتا ہے جو اس (پہلے تصور) کی ضد ہوتا ہے۔ یہ نیا تصور، اس سابقہ تصور کو مٹا کر اس کی جگہ آپ لے لیتا ہے۔ پھر یہ تصور اسی طرح بڑھتا، پھولتا، پھلتا اور جوان ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس میں سے اس

ہیگل اور مارکس کے نظریات

کی ضد دوسرا تصور اُبھرتا ہے. تصوّرات کی یہ کشمکش شروع سے مسلسل چلی آرہی ہے اور اسی طرح چلی جائے گی. تاریخ اسی کشمکشِ پیہم کی داستان ہے.

آپ نے دیکھا کہ ہیگل کے نظریہ کی رُو سے، دنیا میں ثبات اور دوام کسی تصور کو نہیں. ہر تصوّر کچھ مدت کے لئے جلوہ بار ہوتا ہے اور پھر مُرجھا کر گر پڑتا ہے اور اس کی جگہ اس سے متضاد تصور لے لیتا ہے. اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ (ہیگل کے نزدیک) کوئی تصور نہ اپنی ذات میں خیر ہے، نہ شر. نہ حق ہے نہ باطل. اس کے برعکس، قرآن نے جو اصول پیش کیا ہے اس کی رُو سے ایک تصوّر اپنی ذات میں حق اور صداقت کا جوہر پنہاں رکھتا ہے. اور اسی میں اس کے ثبات و دوام کا راز مضمر ہے. اس کے برعکس، دوسرا تصوّر اپنی تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ رکھتا ہے اور جب بھی حق کے مقابلہ میں آتا ہے. خاسر و نامراد رہ کر فرار ہو جاتا ہے. تاریخ حق و باطل کی اسی کشمکش کی داستان ہے.

مارکس نے ہیگل ہی سے تاریخ کا نظریہ لیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس نے کہا ہے کہ دنیا میں ایک نظام پیدا ہوتا ہے. (ہیگل نے تصوّر کہا تھا. مارکس نے اس کی جگہ نظام کہا). کچھ عرصہ تک وہ نظام چلتا ہے. جب وہ شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام اُبھرتا ہے. جو پہلے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ خود مسلط ہو جاتا ہے. جب یہ نظام انتہائی عروج تک پہنچ جاتا ہے. اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو اس کی جگہ متمکن ہو جاتا ہے. تاریخ انہی مختلف نظاموں کی آمد و شد کی کہانی ہے.

قرآن کی رُو سے یہ نظریہ بھی غلط ہے. اس کا پیش کردہ اصول یہ ہے کہ جو نظام حق کی بنیادوں پر متشکل ہوگا، اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوگی. جو باطل کے خطوط پر قائم ہوگا وہ حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا. تاریخ کا مطالعہ ہمیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے.

تاریخی وجوب

جب ہیگل یا مارکس سے پوچھا گیا کہ ایک تصوّر کی جگہ دوسرا تصور اور ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام کس قوت کے بل پر آتا اور چھا جاتا ہے تو ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایسا تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) سے ہوتا ہے اسی کو زمانے کا تقاضا کہتے ہیں. ظاہر ہے کہ یہ جواب ایک اصطلاح کی آڑ میں پناہ لینے سے زیادہ کچھ نہیں. قرآن کے الفاظ میں أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ (۱۲/۴۰) یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے یا تمہارے اسلاف نے رکھ لئے ہیں. ان کی حقیقت کچھ نہیں. اس کے برعکس، قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ کارگہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس

مقصدِ عظیم کے لئے سرگرم سعی و عمل ہے کہ تعمیری قوتیں کامیاب و نتیجہ خیز ہوں اور تخریبی قوتیں آخر الامر مغلوب و منکوب رہیں. یعنی مقصدِ تخلیقِ کائنات حق کا غلبہ اور باطل کی شکست ہے اور یہ ناگزیر اور لاینفک ہے.

آپ نے دیکھا کہ قرآن کے پیش کردہ تاریخی تصور اور ہیگل اور مارکس کے تاریخی نظریہ میں کس قدر بنیادی فرق ہے.

ثبات و دوام کس کے لئے ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وُہ کونسا تصور یا نظام ہے جس کے لئے ثبات و دوام ہے اور جسے حق پر مبنی نظام کہا جائے گا. اس کی تفصیل طول طویل ہے. لیکن قرآن نے اس تفصیل کو ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں یوں سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان. سورۃ رعد میں ہے کہ آؤ تمہیں ایک دو مثالوں کے ذریعے بات سمجھائیں. اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً. آسمان سے بارش برستی ہے فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا. تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں. فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا. اور اس طرح سیلاب اس جھاگ (اور خس و خاشاک) کو بہا کر لے جاتا ہے جو پانی کے اوپر آجاتی ہے. یعنی پانی جو لوگوں کے لئے باعثِ منفعت ہوتا ہے، باقی رہتا ہے اور خس و خاشاک اور کوڑا کرکٹ سب بہہ جاتا ہے. وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ. جب سونا یا کوئی دھات آگ میں پگھلاتے ہیں تاکہ اس سے زیور یا دیگر اشیائے مستعملہ بنائی جائیں تو وہاں بھی یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے. یعنی خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے اور ملاوٹ جھاگ کی شکل میں اوپر آجاتی ہے جسے باہر پھینک دیا جاتا ہے كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ. اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے. ان کی کشمکش میں بھی یہی ہوتا ہے کہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً. جھاگ اور میل کچیل جنس ناکارہ کی طرح رائگاں چلی جاتی ہے. وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ

اور ہر وہ شے جو نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے زمین میں باقی رہ جاتی ہے كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳/۱۷) اس طرح اللہ مثالوں سے تبیانِ حقیقت کرتا ہے.

یعنی کائنات میں ثبات و دوام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ہر وہ نظریہ، ہر وہ تصوّر، ہر وہ نظام جو کسی خاص گروہ، خاص ملک یا خاص قوم نہیں. بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو اسے بقا اور استحکام ہوگا. جو اس کے خلاف جائے گا وہ فنا ہو جائے گا. بالفاظِ دیگر حق کی عملی پہچان یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش (تعمیری نتائج کا حامل) ہوتا ہے اور باطل ضرر رساں (یا تخریبی نتائج کا حامل). یہی ہے وہ بنیادی معیار جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ہوتا ہے. تاریخ اسی کی زندہ شہادت کا نام ہے.

لیکن قرآن محض میکانکی طور پر ایک نظام ہی نہیں دیتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ نظام قائم کیسے ہوگا. اس کے لئے وہ ایک ایسا بلند اور عمیق اصول سامنے لاتا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے وہ کہتا یہ ہے کہ اصل شے یہ نہیں کہ تم نے یونہی خارجی اسباب کچھ اس قسم کے پیدا کر دیئے جن کا نتیجہ نفع رساں ہوگیا. اصل چیز یہ ہے کہ کیا تمہاری داخلی دنیا تمہاری نفسیاتی کیفیت میں بھی اس قسم کی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے جس کا فطری مظاہرہ خارجی نظام کی شکل میں ہوتا ہے؛ بالفاظِ دیگر، قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اصلی اور حقیقی انقلاب وہ ہے جو انسان کی داخلی دنیا میں پیدا ہو. جو خارجی انقلاب، انسان کی داخلی تبدیلی کا مظہر نہیں، اسے انقلاب کہہ ہی نہیں سکتے. باہر کی دنیا کی تمام تبدیلیاں، منحصر ہوتی ہیں انسان کی داخلی دنیا کی تبدیلیوں پر. اس باب میں خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ

داخلی انقلاب

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (۱۱/۱۳؛ ۸/۵۳)

خدا کا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر (نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہیں کرتی اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی.

ایمان کے معنی

یہ داخلی دنیا کی تبدیلی. یہ "انقلاب اندر شعور" ہے جسے قرآن "ایمان" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (مثلاً) ایک قوم مسلسل محنت اور پیہم مشقت سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے. اب سوال یہ ہے کہ وہ، بجائے اس کے کہ ان قوتوں کو اپنی قومی خوشحالی اور سربلندی کے لئے صرف کرے، انہیں نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے کیوں عام کر دے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز صرف "ایمان" (انقلاب اندر شعور) سے پیدا ہو سکتی ہے. یعنی ان حقائق کو تسلیم کرنے سے کہ

(۱) انسان صرف جسم کا نام ہی نہیں. جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے.
(۲) جسم کی پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان خود اپنے لئے استعمال کرے. لیکن انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش اور نشوونما کے لئے دے دے.
(۳) انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے.

جب کوئی قوم ان حقائق پر ایمان لے آئے گی تو اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا. وہ انتہائی کوشش کرے گی کہ دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ اسباب و ذرائع بہم پہنچائے. اس سے وہ نظام قائم ہوگا جو نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوگا. وہ اس نظام کے قیام و استحکام میں "دوسروں کی منفعت" سے کہیں زیادہ خود اپنی ذات کی منفعت پنہاں دیکھے گی. یہ ہے وہ داخلی انقلاب جس کا لازمی نتیجہ خارجی انقلاب ہوگا. لیکن اگر کسی وقت اس قوم کا یہ ایمان نہ رہے تو پھر یہ نظام قائم نہیں رہ سکے گا. ہوسکتا ہے کہ یہ (پہلے سے قائم شدہ نظام) محض اپنے زورِ دروں (MOMEMTUM) یا عادت (FORCE OF HABIT) سے کچھ وقت کے لئے چلتا رہے. لیکن تھوڑی دُور جا کر یہ رُک جائے گا. یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی قوم اپنے سیاسی مصالح یا اسی قسم کے اور محرکات کی بنا پر بعض منفعت بخش سامانِ زندگی میں دوسروں کو بھی شریک کرلے. لیکن اسے آپ 'نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش نظام نہیں کہہ سکتے. اس قسم کے نظام کا قیام 'بغیر اندرونی انقلاب کے ناممکن ہے. یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام صلاحیت بخش اعمال (اعمالِ صالحہ) کے لئے "ایمان" کو لازمی شرط قرار دیا ہے.

قرآن پورے حتم و یقین سے کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں ہوسکتا کہ کوئی قوم اس قسم کے صلاحیت بخش متوازن نظام کی حامل ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷) یاد رکھو! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ تیرا نشوونما دینے والا آبادیوں کو ناحق ہلاک کردے درانحالیکہ اس کے رہنے والے مصلحین ہوں' ہلاکت تو ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ قوم صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کرلیتی ہے.

ہلاکت کس کے لئے ہے؟

فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶/۳۵)

تو کیا غلط روش اختیار کرنے والوں کے علاوہ کوئی اور قوم بھی ہلاک

کی جا سکتی ہے؟

ہرگز نہیں! اس لئے کہ کائنات میں اندھی قوتیں کام نہیں کر رہیں کہ جسے جی چاہا پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا، جسے چاہا آسمان پر چڑھا دیا۔ یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ یہاں موت اور

موت اور حیات عَنْ بَیِّنَۃٍ

حیات کے فیصلے دلیل و برہان کی رُو سے کئے جاتے ہیں۔ لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَیِّنَةٍ وَ یَحْیٰى مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ (۸/۴۲) کہ جسے تباہ ہونا ہے وہ بھی دلیل و برُہان کی رُو سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برُہان کی رُو سے زندہ رہے۔ خدا (معاذ اللہ) "بھیروں ماتا" یا "کالی دیوی" نہیں جو انسان کے خونِ ناحق سے خوش ہوتی ہے۔ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ قوموں پر تباہی ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ (۲۹/۴۰)

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خدا ان پر ظلم کرتا۔ لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ جو قوم ظلم و ستم اور جور و استبداد کی روش اختیار کرتی ہے، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتی ہے اور اپنے مفاد کا تحفظ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ دوسروں سے لوٹ کھسوٹ کر سب کچھ اپنے لئے جمع کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ ظلم اور زیادتی دوسروں کے

ظلم خود اپنے خلاف ہوتا ہے

خلاف نہیں ہوتا۔ خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ غلط اعمال ہیں جن کا فطری نتیجہ اس قوم کی تباہی بربادی ہے۔ وہ قوم دوسروں پر زیادتی کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن قانونِ مکافاتِ عمل، ان کے ان جرائم کا تباہ کن نتیجہ مرتب کئے چلا جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ قوم ایک دن ہلاکت کے جہنم میں جا گرتی ہے۔

یہ تو جُملۂ معترضہ تھا۔ سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ تباہ ہونے والی قومیں خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتی ہیں۔ خدا نے کسی پر ظلم کر کے کیا کرنا ہے؟

مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا ۝ (۴/۱۴۷)

> اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کی قدرشناسی کرو تو اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ وہ تو انسانوں کے اچھے کاموں کا قدرشناس اور ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

مکافات کی میزان

یعنی یہاں سوال "خدا کے ناراض ہو جانے یا اس کے خوش ہو جانے" کا نہیں. یہاں سوال اس کے قانون اور اس کے فطری اور حتمی نتیجہ کا ہے. یہاں نہ تو کوئی قوم خدا کی چہیتی اولاد ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، حکومت وسطوت اور دولت وثروت کی مالک وہی رہے گی. اور نہ ہی کسی قوم سے یونہی "خدا واسطے کا بیر" ہے کہ وہ جتنے اچھے کام جی چاہے کرے اسے ذلیل وخوار ہی رکھا جائے گا. خدا کے ہاں تو (قانونِ مکافات کی) میزان گڑی ہے. جس میں ہر فرد اور ہر قوم کے اعمال کا ایک ایک ذرہ تلتا ہے وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۷-۸/۹۹). نہ کسی سے رعایت ہوتی ہے نہ کسی سے بے انصافی. ہر عمل اپنا نتیجہ (بلاکم وکاست) مرتب کرتا رہتا ہے. جب تک کسی قوم کے ایسے اعمالِ حیات جو قوانینِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوں زیادہ ہوں (یعنی اُن کا پلڑا جھکا رہے) وہ قوم زندگی کی خوشگواریوں اور سربلندیوں سے فیضیاب رہتی ہے (فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۷-۸/۱۰۱) اور جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو جائے وہ تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہے. (وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (۸-۹/۱۰۱).

قرآن نے اس مقام پر، قوموں کی موت اور حیات کے متعلق ایک عظیم اصول بیان کیا ہے. دنیا میں اچھی سے اچھی قوم سے بھی بعض اوقات غلطیاں اور لغزشیں ہو جاتی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جونہی کسی قوم سے کوئی لغزش ہوئی وہ تباہی کے جہنم میں جا گری. اُس قوم کے خوشگوار نتائج پیدا کرنے والے اعمال (حسنات) اس قسم کی لغزشوں کی تلافی کر دیتے ہیں (جیسے تندرست وتوانا آدمی سے اگر کوئی چھوٹی موٹی بدپرہیزی ہو جائے تو اس سے اس کی موت واقع نہیں ہو جاتی) یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) لیکن جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کی حسنات کا پلڑا برابر اوپر کو اُٹھتا جائے اور سیئات کا پلڑا جھکتا جائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہے. اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم کی ہلاکت فوراً نہیں واقع ہو جاتی. اس کی غلط روش غیر محسوس طور پر اپنے ہلاکت آفرین

نتائج مرتب کرتی چلی جاتی اور اسے بتدریج فنا کے گھاٹ کی طرف لے جاتی ہے۔ قرآن میں ہے فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ جو اس حقیقتِ ثابتہ کو جھٹلاتا ہے (اے رسول) تو اُسے میرے حوالے کر دے۔ میرا قانونِ

بتدریج ہلاکت کی طرف

مکافات ایسے لوگوں سے خود نپٹ لے گا۔ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۶۸/۴۴) ہم انہیں بتدریج ایسے مقام تک لے جائیں گے جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔

اگر وہ قوم ہلاکت کی آخری منزل تک پہنچنے سے پہلے، اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لیتی ہے (جسے قرآن کی اصطلاح میں تَابَ وَاَصْلَحَ کہتے ہیں) تو وہ ہلاکت سے بچ جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی اور اپنی غلط روش پر بدستور آگے بڑھتی جاتی ہے تو وہ آخرالامر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہلاک کہ پھر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔

وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ○ (۲۱/۹۵)

اور اس قوم کے لئے جسے ہم نے (ان کے جرائم کی پاداش میں) ہلاک کر دیا۔ یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ دوبارہ لوٹ نہیں سکے گی۔

چونکہ اس قوم کی یہ تباہی اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے اس دردانگیز انجام پر کائنات کی آنکھ میں آنسو تک نہیں آتا۔

فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ○ (۴۴/۲۹)

(ان کے اس انجام پر) نہ آسمان رویا نہ زمین۔ اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔

یہ مدت جس میں کوئی قوم بامِ عروج پر پہنچتی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ قعرِ مذلت میں گر کر ہلاک ہو جاتی ہے، اس قوم کی اجل (معیاد) کہلاتی ہے۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ (۱۰/۴۹) ہر قوم کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۴۹) اور جب اس کی یہ میعاد ختم ہو جاتی ہے (اجل آجاتی ہے) تو پھر اس میں نہ ایک گھڑی بھر کی تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم یعنی جب خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس قوم کی ہلاکت کا وقت آجاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس میں ذرا بھی دیر سویر نہیں کر سکتی۔

اجلِ معیّنہ

لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ قوم کی مدتِ حیات پہلے سے متعین ہوتی ہے یعنی

ہر قوم کی "تقدیر" میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ اس نے اتنے سو سال تک حکومت کرنی ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قوموں کی موت وحیات کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ لہٰذا کسی قوم کی زندگی اور عروج کی مدت بھی اسی قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ یعنی جب تک وہ قوم خدا کے حیات بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے زندہ اور توانا رہتی ہے۔ جب اس پروگرام کو چھوڑ دیتی ہے، تباہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (ہر قوم کی ایک مدتِ حیات ہوتی ہے) اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) ہر مدت کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔

ہلاکت کے معنی

گذشتہ صفحات میں قوموں کے لئے ہلاکت کا لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے۔ ہلاکت کے معنی یہ نہیں کہ وہ قوم طبعی طور پر (PHYSICALLY) صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص خطہ میں بسنے والی قوم طبعی طور پر ختم ہو جائے۔ لیکن ہلاکتِ اُمم کے معنی اس سے کہیں وسیع ہیں۔ قرآن کی رُو سے قوموں کی ہلاکت کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم حکومت وسطوت، اور عزت واقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت وزوال اور محکومی و محتاجی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ اس قوم کے افراد جیتے ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیاتِ اجتماعیہ (ملی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے۔ خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ اسے اس قوم کی ہلاکت کہتے ہیں۔ جب کوئی قوم اس طرح ہلاک ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ (مسندِ حکومت وسطوت پر) کوئی دوسری قوم متمکن ہو گئی ہے۔ اسے قوموں کا استخلاف (ایک کے بعد

استخلاف و استبدالِ قومی

دوسری قوم کا آجانا) یا استبدال (ایک کی جگہ دوسری قوم کا بدل جانا) کہتے ہیں۔ قرآن نے استبدالِ قومی کا ذکر اسی حقیقت کی تبیان کے لئے کیا ہے۔ هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام واستحکام کے لئے اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھو فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ مگر تم میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے باوجود سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لیتے ہیں وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ سو یاد رکھو جو شخص اس طرح سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لیتا ہے اور دوسروں کو سامانِ نشوونما سے محروم رکھتا ہے

تو وہ سمجھ لے کہ وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ خود اپنی ذات کو سامانِ نشو و نما سے محروم رکھتا ہے۔ باقی رہا اللہ، سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ تم اس کے محتاج ہو وہ تمہارا محتاج نہیں۔ وہ کسی کا بھی محتاج نہیں۔ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اس طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت سے روگردانی کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یہ ہے قوموں کی ہلاکت سے مفہوم۔ مندرجہ بالا آیت کا آخری ٹکڑہ (ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ قابلِ غور ہے۔ یعنی یہاں ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ کارفرما نہیں کہ ایک قوم (تصور یا نظام) کی جگہ بہرحال دوسری قوم نے لینی ہے خواہ یہ دوسری قوم کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔ یہاں قانون یہ ہے کہ تبدیل وہ قوم کی جاتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی اور اس کی جگہ وہ قوم لیتی ہے جو اُس (جانے والی) قوم سے بہتر ہوتی ہے۔ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ (۷۰/۴۰) ہم اس پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر قوم کو ان کی جگہ بدل کر لے آئیں۔

یہ ہے خدا کا وہ اٹل قانون جس کی شہادت تاریخ کے صفحات پیش کرتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ حقیقت

اقوامِ سابقہ کی تاریخ

جس تک پہنچنے کے لئے اس نے تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیا ہے۔ وہ اقوامِ حاضر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○ (۶۴/۶-۵)

کیا تمہارے پاس اقوامِ سابقہ کی تاریخ نہیں پہنچی۔ یعنی ان اقوام کی جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار کیا سو انہوں نے اپنی غلط روش کا تباہ کن انجام دیکھ لیا۔ یعنی وہ درد انگیز سزا کے مستوجب بن گئے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح قوانین لے کر آتے رہے (لیکن وہ ایک ایک کی تکذیب کرتے رہے) اور کہتے رہے کہ "واہ! اب ہمارے جیسے انسان ہماری راہ نمائی کریں گے؟" سو انہوں نے اس کا انکار کیا اور ان قوانین سے روگردانی

کی۔(سو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑا) اللہ تو سب سے مستغنی ہے۔ بالکل مستغنی اور ہر قسم کی حمد و توصیف کا مالک۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ استبدالِ قومی (ایک قوم کی ہلاکت اور اس کی جگہ دوسری قوم کا تمکّن فی الارض یونہی سوتے سوتے نہیں ہو جاتا۔ تباہ ہونے والی قوم کے اندر معاشرتی فساد رونما ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے جس سے ان کی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہ بھی خدا کا عذاب (یعنی ان کے اعمال کے نتائج اور ان کے جرائم کی پاداش) ہوتی ہے۔ اس عذاب کی کئی شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں سب سے نمایاں شکل وہ ہے

عذاب کی شکل

جسے قرآن نے سورۂ انعام میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ

(۶/۶۵)

ان سے کہہ دو کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اعمال کی سزا مختلف انداز میں وارد کر دے۔ (مثلاً) اس طرح کہ تمہارے اوپر مستبد اور جابر حکام مسلط ہو جائیں جو اپنے جور و ستم سے تمہیں روند ڈالیں۔ یا معاشرہ کے عوام نظام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور اس طرح نظم و نسق کو تہس نہس کر دیں۔ یا اوپر کا طبقہ (لیڈر) عوام کو اپنے ساتھ ملا کر مختلف پارٹیاں بنالے اور اس طرح یہ پارٹیاں آپس میں سر پھٹول شروع کر دیں۔ یہ ہیں باہمی جنگ و جدال کی وہ مختلف شکلیں جن سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتے اور اس طرح تم سے حکومت و سطوت چھن کر کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں چلی جاتے۔ اس قسم کی خانہ جنگیوں میں، یا مختلف (مستبد) اقوام کی باہمی آویزشوں میں ہوتا یہ ہے کہ جو زیادہ قوت فراہم کر لیتا ہے وہ دوسروں پر بزور مسلط ہو جاتا ہے۔ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۶/۱۲۹)۔ لیکن مستبد قوتوں کا اس قسم کا غلبہ و تسلط، انہیں ثبات و دوام عطا نہیں کر دیتا۔ یہ محض وقتی اور ہنگامی تغلب ہوتا ہے۔ اگر محض قوت کی بنا پر قوموں کو دوام نصیب ہو جاتا تو دنیا کی کئی قومیں آج تک برسرِ اقتدار ہوتیں۔ لیکن

محض قوت سے دوام نہیں ملتا

قرآن بتاتا ہے کہ چونکہ ان کا تصوّرِ حیات غلط اور نظریۂ زندگی باطل تھا اس لئے وہ، اپنی قوت و سطوت کے باوجود تباہ و

برباد ہوگئیں۔ وَ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۳۰/۹ ; ۴۰/۲۱ ; ۴۰/۸۲ ; ۴۱/۱۵ ; ۴۷/۱۳) یہ بھی نہیں کہ یہ قومیں جاہل اور گنوار، وحشی اور غیر مہذب تھیں۔ وہ علم و ہنر کی مالک اور تہذیب و تمدن کی حامل تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھنے بھالنے والی تھیں۔ (وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۲۹/۳۸) ان کے پاس ذرائع علم سب موجود تھے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً (۴۶/۲۶) وہ سماعت و بصارت اور قلب سب کچھ رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے اور اس کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے ان کا علم و ہنر ان کے کسی کام نہ آیا۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (۴۶/۲۶)

سرمایہ پرستوں کی طرف سے ابتدا

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ سب سے پہلے خرابیاں قوم کے اوپر کے طبقہ سے شروع ہوتی ہیں جو مرفہ الحال اور دولت مند ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاتے ہیں اور اسی روش پر چلے جانا چاہتے ہیں۔ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱/۱۱۶) انہی کو دوسری جگہ اکابر مجرمین کہا گیا ہے جو مختلف قسم کی سازشیں کرتے رہتے ہیں تاکہ نچلا طبقہ ان کی ہوسناکیوں کا آلۂ کار بنا رہے۔ حالانکہ یہ سازشیں خود ان کی اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہیں لیکن وہ اس بات کو سمجھتے نہیں (۶/۱۲۳) اس سے معاشرہ میں خرابیاں عام ہوتی چلی جاتی ہیں اور کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو ان ناہمواریوں کا سدِباب کر سکے (۱۱/۱۱۶)۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو وہ قوم اپنے سامانِ معیشت کی فراوانیوں کے باوجود (بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا) (۲۸/۵۸) تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ تباہی کہیں باہر سے نہیں آتی۔ یہ خانہ ویرانی ان کے اپنے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ (يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ (۵۹/۲) اس سے قوم قرآن کے الفاظ میں "کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے انگارے کی طرح ہو جاتی ہے۔" (وَجَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ. ۲۱/۱۵) اور تاریخ کے صفحات پر اس کی فقط داستانیں باقی رہ جاتی ہیں وَ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (۲۳/۴۴) ان کی آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ ان کے کنوئیں بے کار ہو جاتے ہیں۔ ان کے محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں (۲۲/۴۵) یہی ہیں وہ کھنڈرات جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کرو۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۷/۶۹) اور دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا۔ لیکن یہ انجام انہی کو نظر آ سکتا ہے جو آنکھیں رکھتے ہیں۔ وہ آنکھیں نہیں

جو ماتھے میں گڑی ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ آنکھیں جو دل کے اندر ہوتی ہیں۔ (فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) اس لئے کہ جب انسان اندھا ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ماتھے کی آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔

خوش بخت ہیں وہ قومیں جو تاریخی شواہد سے اپنے اعمالِ حیات کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں کہ قرآن نے تاریخ کے مطالعہ کا یہی مقصد بتایا ہے۔ لیکن جو قوم محض مُردوں کو "ثواب" پہنچانے کی خاطر قرآن پڑھے، وہ اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتی ہے؟

مُسلمان کی زندگی

(اکتوبر ۱۹۳۹ء)

جب انسان پر مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں، ظلمت کدۂ عالم میں اُمید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی، تمام اسباب و علل ایک ایک کرکے جواب دے دیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے. زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے. عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذرّوں سے اُبھرتے چلے آتے ہیں. وہ اُن کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے. زندگی اسے مسلسل مصائب و تکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے. انسان اسے ایک بے کس و بے بس مجبور و مظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور و ستم اور ظلم و استبداد کی المناک صعوبتیں جھیلنے کے لئے اس وحشتناک کرّہ میں بھیج دیا ہے. چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اسے دیکھے، اس لئے جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرّت و شادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی. ہر چہرہ تبسّم ناآشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے. وہ سوچتا ہے اور ہر بار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

> زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے. خالص اور دوامی مصائب. ہر آرزو ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ ہے. لہٰذا سکون و اطمینان عدم آرزو میں ہی ہے. (مہاتما بدھ)

وہ حیاتِ انسانی کو ایک لغو و باطل شے قرار دیتا ہے. وہ سمجھتا ہے کہ زندگی محض سراب ہے، دھوکا ہے. مایا کا جال ہے. (اپنشد). وہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو رُخ خیال کرتا ہے (شوپنہار). وہ اس مصیبت کدہ سے دُور بھاگنا چاہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے. چونکہ وہ سمجھتا ہے

اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں اس لئے اسے عام انسانوں سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اور چونکہ عام انسانوں میں سے صاحبانِ ثروت واقتدار کو وہ اپنی لُٹی ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے اس لئے' ان انسانوں کے خلاف نہیں' بلکہ خود دولت وثروت' شوکت وسطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے. وہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دُور جنگلوں میں جاکر بسیرا کرلیتا ہے. اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت وعزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے. وہ یہ کہہ کر اپنے قلبِ محزوں کو تسلّی دے لیتا ہے کہ خیر' اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہے کرلیں" آسمانی بادشاہت" میں تو ان لوگوں کا کوئی حصّہ نہیں ہوگا. وہ ستم رسیدہ' کمزور' ناتواں' ضعیف' مغلوب ومقہور

ترکِ دُنیا

انسان کو یہ کہہ کر مطمئن کردیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نہیں. اس کے طالب خُدا کی نگاہوں میں مردود وملعون ہیں. البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں وہ لوگ جو یہاں دولت وحشمت کے مالک ہیں ذلیل وخوار ہوں گے' اور جو آج ذلیل وخوار ہیں وہ معزز ومکرم. آسمانی بادشاہت انہی مفلس وغریب انسانوں کی وراثت ہے. نرداتا ہیں یم کے مقرّب یہی لوگ ہوں گے. دیولوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے یہی بھگت ہیں. یہی تعلیم کنیسہ وصومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے. یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیاسی اور تیاگی بھکشو کا سچّا دھرم ہے. اس فلسفہ اور مشرب کی لِم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کرکے مستقبل کو مزیّن بنایا جائے. دنیا کی رسوائیاں' عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں. یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزت ہو. یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو. یہاں کا محتاج وہاں کا غنی. یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوشحال. اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو. وہ یہاں کے مصائب وآلام کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھائے کیونکہ اسے ان میں ابدی مسرّتوں کے پیام نظر آرہے ہیں. غرضیکہ وہ دنیا وآخرت کے درمیان ایک ایسے ناقابلِ شکست آئینہ کی سدِّ سکندری قائم کردے جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے.

لیکن کیا یہ تعلیم' خالقِ کائنات کی دی ہوئی تعلیم قرار دی جاسکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور ومقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اِس جیل خانہ میں عمر بھر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقع یہ منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کردینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابلِ نفرت وملامت ہیں؟ کیا یہاں کی ہر سہاونی شے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے؟ کیا مقصدِ حیاتِ انسانی' ذلت ورسوائی' محتاجی وناداری' نکبت ومسکنت'

کیا دنیاوی زندگی ذلیل ہے

افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے؟ کیا پھر ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم، یہاں کی رسوائیوں اور ذلتوں کے معاوضہ میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصّہ ہو گی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی دبکتی دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہو گا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس تک بٹھانا پسند نہ کرے؟ کیا دولت و حشمت، عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہو گی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا باب السلام قطعاً مسدود ہو گا؟ یہاں کے چاندی اور سونے کا ہر ٹکڑا جہنم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا؟ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے؟ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب آپ اپنے دماغ سے، کہ جس پر ایک عرصۂ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، کچھ ہی دیجئے اور اس سے مطمئن ہو جائیے۔ لیکن آئیے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے، کہ وہی تعلیم، تعلیمِ خالقِ فطرت اور وہی حکم حکمِ خداوندی ہو گا۔

قرآنِ کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن، اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کی خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (۴۵/۱۳)

پستیوں اور بلندیوں (ارض و سمٰوٰت) میں جو کچھ ہے سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

انسان کی پوزیشن

لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے۔ فطرت کی ہر چیز سے کام لے کیونکہ یہ سب ایک معیّنہ مدّت تک اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدا تعالیٰ نے حرام نہیں کیں (۷/۳۲) بلکہ ان میں انسان کے لئے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے (۳/۱۳)۔ ان سے فائدہ اٹھانا، ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کے غلط استعمال سے ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی ناہموار ہو جاتی ہے جس سے ہمارے اجتماعی نظام میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت و پستی کی زندگی بھی

انسانی تخلیق کی غرض وغایت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم ہمیشہ اس افراط و تفریط کو مٹانے کے لئے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمادیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا اس باب میں اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لم رہی ہے۔ یعنی وہ ان عیوب اور نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت اور قوت کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو اُبھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور انہیں ایسی تعلیم دیتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو مترفین میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ دولت و ثروت کے غلط استعمال سے نظامِ انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضرات انبیاء کرامؑ جن کمزوروں کو ابھار کر بلند سطح پر لاتے تھے انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا تم نے حدود اللہ کی نگہداشت کرنا ورنہ ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے۔ وہ قوانینِ الٰہی سے مُنہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کر دیتے تھے جس سے ان کے اور خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس طرح انسانیت کا نظام متوازن و ہموار طریق پر چلتا رہے۔ بس یہ ہے خلاصہ آسمانی تعلیم کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اسی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سُرخروئی ہے۔ میزانِ خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے یہ پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے اُبھر نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ یاد رکھیئے! اگر نعمائے آخرت خدا کا انعام ہیں تو دنیاوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاددہانی اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہٰذا

دُنیا اور آخرت

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷/۶۹)

اللہ کی یہ نعمتیں یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قوم ثمود سے کہا۔

تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اُس نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں متمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (محفوظ عمارات تعمیر کرتے ہو سو اللہ کی نعمتوں کو پیش نظر رکھو اور زمین میں فسادات مت پیدا کرو۔ (۷/۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی (۷/۸۶)۔ حضرت ابراھیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۶/۱۲۲)۔ اور آلِ ابراھیمؑ کتاب وحکمت کے ساتھ ملکِ عظیم کی بھی مالک بنائی گئی (۴/۵۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر گردش کے بعد جس نعمتِ عظمےٰ سے سرفراز کیا گیا وہ تمکن فی الارض تھا اور اس عطیۂ کبریٰ کو ان کے صبر وتقویٰ کا اجر جزیل کہا گیا۔

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں صاحبِ حکومت بنادیا (متمکن فی الارض کردیا) کہ وہ جہاں چاہیں رہیں سہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچادیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ (۱۲/۵۶)

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت وحشمت، تمکن وتسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس شدت وتکرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوتے ہیں کوئی اور واقعہ اس شدومد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر خاص احسان کہا گیا ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کردیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو دیگر اقوام کا امام بنادیں اور ملک کا وارث قرار دے دیں اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کردیں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھادیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ (۲۸/۵-۶)

چنانچہ اسی ضعیف وناتواں، اسی محکوم ومغلوب قوم کو بالآخر مشارق ومغارب کا حکمران بنادیا گیا۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ

قَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ٥ (۷/۱۳۷)

اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی اس بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا۔ اور آپ کے رب کا وعدہ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

صبر و توکل، سعی و عمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لئے حضرت موسیٰؑ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تعالیٰ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے وہ جسے چاہے (اپنے قانون کے مطابق) اپنے بندوں میں سے ان کا مالک بنا دے۔ اور آخری انجام تو متقین کے لئے ہی ہے۔ (۷/۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی۔

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا اور تمہیں تمام اقوامِ عالم پر برتری عطا کی تھی۔ (بقرہ و دیگر مقامات)

اور جب اس قوم نے قوانینِ الٰہی سے سرتابی اختیار کی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اس نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

(۲/۶۱)

اور ان پر ذلت اور مسکینی کی مار ماری گئی اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

○

تاریخی یادداشتیں

مذکورہ صدر قصص، قرآنِ کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں۔ بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم اممِ گذشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے۔ اور بار بار تاکید کرتا ہے کہ غور و فکر سے دیکھو كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ. جن قوموں نے قوانینِ الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان مقامات میں اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف

توجہ دلانا ہی مقصود ہے. کیونکہ آخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا. ان میں سے بعض قومیں قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی محض داستانیں تاریخ میں باقی رہ گئیں. وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (۲۳/۴۴). اور بعض قومیں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں) مگر ان کی حالت عبرت و موعظت کی زندہ داستان ہے. پھر قرآن کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ واضح الفاظ میں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اس کا عذاب اور غضب ہے. مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان لاتے اور عملِ صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا حاکم بنائے گا (۲۴/۵۵). کہیں یہ تشریح ہے کہ جو کوئی عملِ صالح کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت، شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اس کو خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے (۱۶/۹۷) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے (۱۶/۴۱) جو اس کے دیئے ہوئے کی قدر کرتا ہے

قرآن کی تعلیم

اپنی قوتوں اور اس کی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے، کہ یہی عملاً شکرِ نعمت ہے، اللہ اپنی ان نعمتوں میں اور اضافہ کرتا جاتا ہے (۱۴/۷) برعکس اس کے جو قوانین خداوندی سے بلا علم و ہدایت، بلا دلیل و برہان جھگڑتا ہے. ان قوانین سے منہ موڑ لیتا ہے. وہ خود بھی منزلِ مقصود تک لے جانے والے راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے. اس کی سزا یہ ہے کہ اسے دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہو گی. اور اس کے بعد کی زندگی میں عذابِ حریق ملے گا (۲۲/۸) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے مانے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اسے اختیار کرے اور جس میں کسی قربانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ اس کی طبع سہولت پسند پر گراں گزرے، اس سے پہلو تہی کر لے، اس کے لئے بھی خزی فی الحیٰوۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے (۲/۸۵) ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں.

اس تصور کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد مسلمانوں کے لئے ایک دستور العمل ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا. جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے جو اقوامِ گذشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود تھا. ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی.

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ

اَلسَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۷/۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوٰے اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔

اور اسی ایمان و تقویٰ سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم نے تقوٰے اختیار کیا تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائے گا اور تمہاری لغزشوں کو دُور کر دے گا اور تمہاری کوتاہیوں سے درگذر کرے گا اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ (۸/۲۹)

مومنین کی زندگی

اس لائحہ عمل کی رُو سے جو قرآنِ کریم نے تجویز کیا' ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد' غیر منقطع سعی و عمل' ان تھک کوشش' کوہ شکن عزم' غیر متزلزل استقامت' پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسنِ عمل' اپنے اعمالِ صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی' محتاجی و فلاکت کی زندگی' مجبوری و بے بسی کی زندگی کہ جسے قرآن نے غضبِ خداوندی کا نتیجہ قرار دیا تھا' نصیبِ اعداکر کے خود عزت و وقار کی زندگی' خوشحالی و خوش بختی کی زندگی' عظمت و شوکت کی زندگی' حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا' کہ یہی قرآنِ کریم کی رُو سے ایک مومن و عملِ صالح کرنے والی جماعت کی حیاتِ طیب ہو سکتی تھی' ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل "اپنے اللہ سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا" (۳/۱۴۷)۔ وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم میں سے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کر لیا تھا (۳۵/۳۲)۔ جسے نوعِ انسانی میں سے بہترین اُمت قرار دیا تھا (۳/۱۰۹)۔ ایسے عبادِ صالح بننا تھا جن کے لئے وراثتِ ارضی مقدر ہو چکی تھی (۲۱/۱۰۵) اور عملاً بتا دینا تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کے لئے ایک عظیم الشان پیغامِ موعظت ہے۔ بلاغِ مبین ہے (۲۱/۱۰۶) اور ساری دنیا کو دکھا دینا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ٥ (۱۰/۶۴)

ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی۔ یہ قانونِ الٰہی

غیر متبدل ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں (۴/۵۱) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ سکّانِ ارضی کو عملاً بتا دینا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے (۲/۴۵)۔ کس طرح دشمنوں کے جمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر رکاب چومتی ہے (۸/۴۵) الغرض انہیں اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر کے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں، ہر قسم کی کامیابیاں، صرف مومنین کے لئے ہیں۔ مجاہدین کے لئے ہیں۔ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلۡخَيۡرَٰتُۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ (۹/۸۸) اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔" انہوں نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا اور ان کے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دئے جو اُن سے کئے گئے تھے۔

وَأَوۡرَثَكُمۡ أَرۡضَهُمۡ وَدِيَٰرَهُمۡ وَأَمۡوَٰلَهُمۡ وَأَرۡضٗا لَّمۡ تَطَـُٔوهَاۚ
وَكَانَ ٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٗا ۝ (۳۳/۲۷)

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے۔ لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے (۸/۴۳)۔ جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں جس سے یہ انہیں زیادہ دکھائی دیں (۸/۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی جنہیں کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔ اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعدا کے دل میں ان کا رُعب ڈال دیا جاتا (۸/۱۲)۔ کبھی ان میں کا ایک دو دو پر بھاری ہوتا (۸/۶۶) کبھی دس دس پر (۸/۶۵)۔ ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ لپٹی ہوتی خدا کی (۸/۱۷ — ۸/۱۷)۔ ان کے مقابلہ میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی نہ قوت۔ اس لئے کہ یہ قوانینِ خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ اور ہر میدان ان کے قبضہ میں ہوتا۔ اور اس طرح بتا دیا جاتا کہ فَٱنصُرۡنَا عَلَى ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی

محنت ضائع نہیں کیا کرتا. یہ اس کا وعدہ ہے. چنانچہ اس وعدہ کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تند و تیز مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں، رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا' چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجرِ طیّب کی طرح یوں بڑھا، پھولا، پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں، اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا تھا.

> محمدؐ اللہ کے رسول اور ان کے ساتھی، کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں محبت والے.
> تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع میں کبھی سجدوں میں. اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے
> ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں. یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں
> اور انجیل میں. جیسے کھیتی کہ پہلے اس نے اپنی سوئی نکالی' پھر وہ درست ہو کر اوپر کو اُبھری'
> پھر وہ اور موٹی ہوئی' پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ (اسے دیکھ کر) کسان
> کا دل مسرت سے اُچھل پڑے اور اس سے حاسدین جل جائیں. اللہ نے ان لوگوں سے
> جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا
> (وہ یوں پورا ہو کر رہا). (۴۸/۲۹)

چنانچہ اللہ کے یہ مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے' تو وہ وقت انہیں یاد آتا جب وہ قلیل تھے. ملک میں کمزور و ناتواں شمار کئے جاتے تھے. اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں اُچک کر نہ لے جائیں. سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی! اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی. اور انہیں بڑی نفیس چیزیں عطا فرمائیں کہ وہ خدا کے شکر گزار بندے بنیں" (۸/۲۶). اسی انقلابِ عظیم کا احساس تھا جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرتے کہ

> یہ وادی ضجنان وہی ہے جس میں ایک ادنیٰ کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا. وہ سخت
> مزاج آدمی تھے. کام لیتے تو تھکا دیتے تھے. کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے. اور آج یہ حالت ہے
> اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت حائل نہیں.

لیکن یہ دَور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین، عبادات کا صحیح مفہوم' اعمالِ صالح کی سچی تفسیر' دنیا اور آخرت کا حقیقی تعلق، قرآنِ کریم کا عملی نظام' اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر' ہر مسلمان کے سامنے تھی' بہت

اس کے بعد؟

جلد ختم ہو گیا. خلافت ملوکیت سے بدل گئی. اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں نمودار ہو گئیں. اور اس کی انتہا عہدِ عبّاسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی تھا اور یکسر عجمی ہو چکی تھی. حکومت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں. وہ مجاہدانہ زندگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی بیگار کے بھرتی شدہ مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا. گرمجوشی کی وہ فاروقی رُوح جو خالد ابنِ ولیدؓ کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اٹھتی تھی (حالانکہ وہ میدانِ جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے انہوں نے ایسا کیا تھا) اب عہدِ کہن کا افسانہ بن چکی تھی، برہمنیت، جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اُمت میں نمودار ہو چکی تھی. علماء کا الگ طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو بجائے تیر و سنان کے لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا. اربابِ طریقت عجمی تصوّف کے تباہ کن نظریہ کے ماتحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر رہے تھے. یہ سب سامانِ ہلاکت پہلے سے جمع تھے کہ شامتِ اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی، اسلام کی مرکزی قوّت فنا ہو گئی. اس کی اجتماعیت بگڑ گئی. مذہب کے علمبردار حضرات مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے. قوّتیں سلب ہو چکی تھیں. حوصلے پست ہو چکے تھے. دنیا ہاتھ سے نکل گئی. عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آ گئی. شوکت و حشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی. نماز، روزہ، حج،

پھر کیا ہوا؟

زکوٰۃ، مناسک و شعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مرتب ہوتے تھے. قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں، اور اس قسم کے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں. اگر اس وقت نصیبہ یاوری کرتا، ہمارے اعمال کی سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی، تو نگاہ اس طرف جاتی کہ یہ تمام عبادات، یہ تمام اعمال، جن کی شکل اسلامی ضرور ہے، اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمال صالح نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہ ہوں جو عہدِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ میں ہوئے. لیکن بدبختی کہ زاویۂ نگاہ اُلٹی طرف بدلا. قرآن کریم نے

زاویۂ نگاہ کی تبدیلی

جہاں جہاں کامیابی، فلاح، سُرخروئی، فوزِ عظیم، رزقِ کریم، حُسنِ مآب مومنین کے لئے مخصوص کیا تھا، ان سب کو آخرت کی زندگی سے مخصوص کر دیا گیا. اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رکھا جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے. اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ

باوجود عقیدہ کی شدّت اور صوم وصلوٰۃ اور تسبیح وتہلیل کی پابندی کے، دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ۔۔۔ یا خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدامست ۔۔۔ یہ مذہبِ مُلّا وجمادات و نباتات

اس وقت بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا کہ ان الفاظ واعمال کی روح مفقود ہوچکی ہے' اس لئے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیا کہ یہ تمام "اعمال" رائگاں نہیں جارہے ان کا نتیجہ اُخروی زندگی میں برآمد ہوگا۔ غیرمسلم خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان پر رشک آتا انہیں اپنے لٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے' اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ابتلا کی زندگی ہے جس میں انہیں مہلت دی گئی ہے۔ اُخروی زندگی میں ہم جنتِ جاودانی اور وہ جہنمِ ابدی میں جائیں گے۔ عیسائی راہبوں کا فلسفہ ترکِ علائق' یونانی مشائین کی حکمتِ ترکِ دنیا' ہندومت کا سنیاس' بُدھ دھرم کا سنسار تیاگ' ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا ترکِ دنیا' ترکِ علائق' ترکِ لذائذ۔ حتیٰ کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خدوخال قرار پاگئے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں ۔۔۔ بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور ۔۔۔ کہ معرکے تھے شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی ۔۔۔ اگر شکست نہیں تھی تو اور کیا تھی شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہوجائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ نظامِ انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ایسی حالت سے یہ کہہ کر محترز رہنے کی تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں دولت وقوّت ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ تمہاری منزلِ مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآنِ کریم میں ایسی تعلیم تھی اسے دنیاوی متاع واسباب سے نفرت دلانے کے لئے بطور نصِ صریح پیش کرنے لگے۔ یعنی طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لئے سر پر برف رکھنے کی تاکید کی تھی' کہ کہیں سرسام نہ ہوجائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض پر کرنے لگ گئے۔ دنیاوی زیب و زینت کو قرآنِ کریم نے بالتصریح حلال فرمایا تھا' وہ سب حرام قرار پاگئیں۔ چیتھڑے پہننا' بھوکے رہنا' خراب و خستہ ہونا۔ بے گھر بے در زندگی بسر کرنا۔ "خدا کے بندوں" کی علامات متصور ہونے لگیں۔ غرضیکہ ایک ایک

کر کے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزوِ اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں جن کو روکنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ اور جس کو اس نے بدعت قرار دیا تھا (۵۷/۲۷)۔ اسلام رہبانیت کا اس لئے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ وہ اس کے اس لئے خلاف ہے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔

اجتماعی زندگی

اسلام افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم، افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ افراد کا تزکیۂ نفس ضروری ہے، اس لئے ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم مرتب ہوگی وہ خود بخود مزکّی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پرزہ ہے۔ جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہر ایک پُرزہ اپنی اپنی جگہ یا قوت و الماس کے ریزوں پر قائم ہو۔ خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو، لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پُرزوں سے نہ ہو تو اس مشینری کے لئے ایسے پُرزے کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس کا فی ذاتہٖ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین ایسی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کو غاروں میں چھُپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا؟ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ایک ذہنیت کے بدل جانے سے تمام تعلیم کی رُوح بدل گئی اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا ہے جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالمِ اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے ہلاک جراثیم پھیل گئے اور آہستہ آہستہ تمام شوکت و حشمت ذلت و مسکنت میں بدلتی چلی گئی۔ حتّٰی کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف تھا، یاس و حرمان کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے۔ اور چونکہ وہی تعلیم جو اس واماندگی، ضعف و ناتوانی، پریشانی و پراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی، اصل اسلام بن چکی ہے، اس لئے عوام تو اس نشے میں مست ہیں کہ یہاں جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں۔ جونہی آنکھیں بند ہوئیں، ہم جنّتِ جاودانی میں جا بیٹھے۔ اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب اسلام کا نتیجہ ہے، اسلام سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ "دین کے علمبرداروں" کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں اور بے دینوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین دار اُن کی دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں" وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے" لہٰذا ان دونوں میں ایک ایسی حدِ فاصل، ایک گہری خلیج حائل ہو چکی ہے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں

کو' دین اور دنیا کو' ناقابلِ اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ "حامیانِ دین" نے اسی وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزت باقی ہے۔ مسلمان غربار کے طبقہ کی حالت آج

غریبوں کی حالت

خون کے آنسو رُلا دینے والی ہو چکی ہے۔ لیکن "دین" کی تمام خدمات کا بوجھ اسی غریب و نادار طبقہ کے سر پر ہے۔ مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کر کے اسے عذابِ قبر اور نارِ جہنم سے بچنے کی دعائیں سکھا کر چلا جاتا ہے۔ شیخِ طریقت اپنا ٹیکس لے کر پاسِ انفاس اور ذکرِ خفی وجلی سے روحانیت بڑھانے کا "صراطِ مستقیم" دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآن کریم کے رزقِ کریم اور حیاتِ طیبہ کے وعدوں کو عاقبت پر اٹھا کر اسے تھپک تھپک کر سلا جاتا ہے کہ یاد رکھو وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. میں نے ایک بہت بڑی مسجد میں جمعۃ الوداع کے وعظ میں سُنا کہ "امام آخر الزماں کا ظہور اس وقت ہوگا جب مسلمانوں کا زوال و انحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گا۔ چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں ان پر چھا جائیں گی۔ اُمید کی کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں اُلٹا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کا زوال آخری حد تک نہیں پہنچا۔ جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائے گی' آنے والا آئے گا اور تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔" جو لوگ کچھ آسودہ حال ہیں ان پر ان "محافظینِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین" کی نظرِ کرم اور قسم کی ہے۔ آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیئے۔ ان مقتدیانِ دین نے اپنے اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے۔ ہزاروں روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرا دئے جاتے ہیں۔ جماعت مخالف کے ائمہ و مشائخ، علمار و اسلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ مقدمے چلتے ہیں۔ دونوں طرف سے ہزار ہا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دینے والے اسے "فی سبیل اللہ" سمجھ کر جنت کے خریدار بنتے ہیں۔ لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھئے کہ اللہ نے اس سلسلۂ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لئے تخلیق کر کے اسے انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ پھر ان انسانوں میں سے اُمتِ مسلمہ کو خیرِ اُمت کہہ کر اس کی تحصیل کے لئے انہیں چُن لیا۔ تو کیا وہ مقصدِ عظیم وہ نصب العین جو فاطرِ کائنات نے اس اجتبار و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا' اس کا حصول' اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیئے' یا بآوازِ بلند' ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ

کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ دراصل قصور ان کا بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے ان کی بنیاد غلط ہے۔ فلاح و سعادت کو اُخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالح کی پہچان حسن مآب، نیک انجام، کامیاب زندگی، حیاتِ طیبہ، استخلاف فی الارض نہ ہو۔ بلکہ اس کی سند اس قسم کے سرٹیفکیٹ ہوں جو مصری خلفاء کے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا، تبدیلی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
این زمین و آسماں دیگر شود

مذہب پرست طبقہ کی حالت

آپ اس طبقہ کو چھوڑیئے جو اسلامی مناسک و عبادات پر عامل نہیں۔ اس طبقہ کو دیکھئے جو ان عبادات پر کاربند ہے۔ ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ قرآن کریم نے انہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا۔ قد افلح المومنونؐ (۲۳/۱-۱۱) انہی کے لئے آیا تھا پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے افلح و اصلح ہونے کے ناکام و نامراد ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا محض اس لئے نہیں کہ یہ "کامیابی" یہ "فلاح و صلاح" محض آخرت سے منسلک کر دی گئی ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ○

(۴۷/۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے۔ یعنی ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ ان سے ان کی برائیاں دُور کر کے ان کی حالت کو بہترین بنا دیا جائے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے صالح کہا جاتا ہے اس کی زندگی انتہائی قابلِ رحم گزر رہی ہے۔ کیا انہوں نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ لیکن ان حضرات کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو یہ فریب

دے رکھا ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام صرف حیاتِ آخرت ہے، یہ دنیا نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا

قرآنِ کریم میں ہے:-

بداعمال لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے کہ ان سب کا مرنا اور جینا، حیات و ممات یکساں ہو جائے۔ یہ بہت بُرا فیصلہ ہے (جو یہ کئے بیٹھے ہیں)۔ (۴۵/۲۱)

صالح اور غیر صالح کی زندگی

یعنی قرآنِ کریم کی رُو سے ایک مومن و صالح کی زندگی ایک بداعمال کی زندگی کے برابر نہیں، بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہیئے۔ یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی اور گمراہی پر ہے۔ لیکن کیا واقعی آج ان کی زندگی جنہیں مومن و صالح کہا جاتا ہے، بداعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے؟ واقعات تو اس کے خلاف بتا رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اعمال و ایمان کے صلے میں رزقِ کریم، عزت و آبرو کی روٹی (۲۲/۵۰) دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر آج یہ کیوں ہے کہ سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے؟ یہ محض زیبِ داستان نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے ذلت و خواری کے وہ منازل طے کرنے پڑتے ہیں جن کے تصوّر سے شرافت کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ زبون حالی اس لئے ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے بجا اور درست؟ لیکن اس "اسلام چھوڑنے" کی تفصیل کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھ گئے ہیں۔ ڈاڑھی منڈانے لگ گئے ہیں۔ ان کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں۔ وغیرہ ذالک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب انداز درست اور صحیح ہیں اور جو آپ کے معیار کے مطابق پکے "مومن" ہیں وہ کون سی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ جس طرح جی چاہے اپنے آپ کو خوش کر لیجئے، لیکن یہ ساری خرابی اس نظریئے کی ہے جو اسلام کے ضعف و انتشار کے زمانہ میں پیدا ہوا اور جس کی رُو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف، انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جگا کر، جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو! دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے یہاں کی شوکت و حشمت

علاج کی زندگی عین اسلامی زندگی ہے۔ مسلمان دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ عزت و وقار، جاہ و سطوت، سربلندی و سرفرازی، اس کے اعمالِ صالح کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت اسلامی ہو تو ہو ان کی روح ہرگز اسلامی نہیں۔ جو یہاں ذلیل ہے اور اس ذلت پر قانع، وہ آخرت میں معزز نہیں ہو سکتا۔ جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی[1]۔

مَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۲/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

یقین مانیئے کہ اس تعلیم کی اشاعت میں آپ کی سخت سے سخت مخالفت ہوگی۔ معتقدات کا چھڑانا افیون چھڑانے سے کم نہیں ہوتا۔

گرفتم حضرتِ مُلّا ترش روست نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم! مرا از کعبہ می راند حق اوست

لیکن اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ تبدیلی از بس لابدی ہے، تو کسی مخالفت کی پروا نہ کیجئے۔ کہیئے اور برملا کہیئے۔ بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت۔ ایک دفعہ اس "اسلامی رہبانیت" کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آیئے پھر دیکھئے کہ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پوچھنا ہی کیا؟ جب خدا کی کتاب زندہ ہے۔ اس کے اندر اس کے رسولؐ کا اسوہ حسنہ زندہ ہے، تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اس قوم کو ہے اس لئے کہ بقاءِ للأصلح فطرت کا قانون ہے اور اس قوم کا ہر عمل، عملِ صالح ہے جو اس کے اندر زندہ اور پایندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے فطرت کے اسی اصول کو، اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ کو، بھانپ لیا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہو گئے ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ وہ اپنے نظامِ زندگی کو خدا کی متعین فرمودہ مستقل اقدار کے تابع نہ رکھ سکے۔ اس لئے ان کا نظام، انسانیت کے لئے ممدِ حیات

---

[1] ان امور کی تفصیل "اسبابِ زوالِ اُمت" میں دیکھئے۔

ہونے کے بجائے وجہِ ہلاکت بن گیا. لیکن بایں ہمہ انہیں وہ قوتیں تو حاصل ہوگئیں جن کی وجہ سے آج تمام دنیا کے مسلمان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں. ناپائیدار ہی سہی تسخیرِ فطرت تو ہوئی. برعکس اس کے مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہوگئی۔

قبضے سے اُمت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی.

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح ہوجاتے تو پھر اس جنتِ ارضی کا پوچھنا ہی کیا تھا؟ ـــ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گزر ہی نہ ہو جس میں یورپ آج گزر رہا ہے اس لئے کہ قرآنِ کریم کے مطابق ایمان و اعمال صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض، یعنی اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے. استبدادؔ ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مسلم و غیر مسلم سب حکومتیں گرفتار ہیں.

یاد رکھیے! جس ایمان و عملِ صالح کا جیتا جاگتا، زندہ و پائندہ نتیجہ اس دنیا میں "خدا کی بادشاہت" کا قیام نہیں یعنی جماعتِ مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں، ضابطہ الٰہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رانی نہیں، وہ ایمان، قرآنی ایمان نہیں. وہ اعمال، اسلامی اعمال نہیں. انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے. نگاہ کا پھیر ہے. مسلمان کے لئے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے. باقی سب فریبِ نظر ہے. ابلیس کے دھوکے ہیں.

ز قرآن پیشِ خود آئینہ آویز — دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوے بنہ کردار خود را — قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

یہ زمین کس کی ہے

(اگست ۱۹۵۷ء)

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

ہمارے ایک اچھے سمجھ دار دوست اگلے دنوں کہہ رہے تھے کہ اس دس سال کے عرصے میں ہمارے ملک نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ جب اُن سے اس اجمال کی تفصیل پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ پاکستان کے بجٹ میں درج شدہ اعداد و شمار کی رُو سے ۴۹-۱۹۴۸ء میں ملک کی کُل آمدنی قریب چھیاسٹھ کروڑ تھی۔ اور ۵۸-۱۹۵۷ء میں میزانِ آمدنی قریب ایک ارب انتالیس کروڑ ہے۔ یعنی اس دس سال میں ملک کی آمدنی دُگنے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ کیا کم ترقی ہے؟

ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جس آمدنی کو وہ "ملک کی آمدنی" سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت "حکومت کی آمدنی" ہے۔ اور ملکوں کی ترقی یا تنزّل کا اندازہ "ملک کی آمدنی" سے لگایا جاتا ہے نہ کہ حکومت کی آمدنی سے۔ اگرچہ وہ اس وقت تو خاموش سے ہو گئے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکے کہ ملک کی آمدنی اور حکومت کی آمدنی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہی احساس ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا خیال ہے کہ (ہمارے اس دوست کی طرح) بہت سے احباب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ چونکہ ہر سال بجٹ میں ہماری آمدنی کی میزان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس لئے ہمارا ملک اقتصادی طور پر کافی ترقی کئے جا رہا ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ اصل حقیقت سے واقف ہوا جائے۔

ہمارے سالِ رواں کے بجٹ میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ کی آمدنی دکھائی گئی ہے۔ ذرا غور کیجئے وہ موٹی موٹی مدات کیا ہیں جن پر یہ آمدنی مشتمل ہے۔

کسٹم (بحری چونگی)	قریب چوالیس کروڑ
اکسائز ڈیوٹی (چونگی آب کاری)	قریب چودہ کروڑ
انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس	قریب اکیس کروڑ
سیلز ٹیکس	قریب چودہ کروڑ
نمک اور متفرق ٹیکس	قریب چار کروڑ
نئی تجاویز کے مطابق ٹیکس	قریب آٹھ کروڑ

یعنی ایک ارب پانچ کروڑ کے قریب یہی ہو گئے۔ باقی کچھ ریلوے کی اور کچھ ڈاک خانہ وغیرہ کی آمدنی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی مدات سے قطع نظر، ان بڑی بڑی مدات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں "ملک کی آمدنی" کس قدر ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک تاجر ولایت سے کوئی چیز منگاتا ہے جس کی قیمت (بندرگاہ پر پہنچ کر) سو روپے بیٹھتی ہے۔ اس پر حکومت پچاس روپے کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے۔ لہٰذا ساحل پر پہنچ کر اس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہو گئی۔ اس ڈیڑھ سو روپے پر (یوں سمجھئے کہ) بیس روپے سیلز ٹیکس ہے۔ یہ ہوئے ایک سو ستر۔ تیس روپے دکاندار کا منافع سمجھ لیجئے۔ لہٰذا خریدار کو اس کے دو سو روپے دینے پڑے۔ دکاندار کے اس منافع سے حکومت نے دس روپے انکم ٹیکس وصول کیا۔

دولت کی گردش

آپ نے غور کیا کہ اس لین دین میں ہوا کیا؟ حکومت نے اسی روپے ملک کے اندر بسنے والے (اپنے) لوگوں سے وصول کئے۔ یہی وہ رقوم ہیں جن کی میزان کو بجٹ میں پاکستان کی آمدنی دکھایا گیا ہے۔ آمدنی کے معنی ہیں PRINCIPAL HEADS یعنی "اندر آنے والی چیز"۔ آپ سوچئے کہ ان تمام رقوم میں کوئی رقم بھی ایسی ہے جو کہیں باہر سے ملک کے اندر آئی ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ تمام رقوم ایسی ہیں جو ملک کے اندر ہی گردش کرتی رہی ہیں۔ ملک میں ایک ادارہ ہے جسے حکومت (گورنمنٹ) کہتے ہیں۔ اس کے ذمہ ملک کا نظم و نسق برقرار رکھنا ہے۔ اس نظم و نسق کے لئے اسے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت یہ روپیہ مختلف مدات میں، ملک کے لوگوں سے وصول کرتی ہے اور پھر ملک میں خرچ کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ روپے کی گردش (CIRCULATION OF MONEY) ہے۔ ملک کی آمدنی

یا (INCOME) نہیں ہے۔ اس لئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں قریب چھیاسٹھ کروڑ روپے آمدنی تھی اور ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں یہ آمدنی دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے تو اس کے بجائے کہنا یہ چاہئے کہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں حکومت اور لوگوں کے درمیان قریب چھیاسٹھ کروڑ روپے نے گردش کی۔ اور ۵۸-۱۹۵۷ء میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ روپے کے گردش کرنے کی توقع ہے۔ ملک کا جو روپیہ ملک کے اندر گردش کرتا رہے اسے ملک کی آمدنی کہنا حدیثِ بے خبراں ہے اور اس گردش (CIRCULATION) کی زیادتی کو اقتصادی ترقی سمجھنا خوش فہمی۔

اپنا ہی خون

اپنے روپے کو آمدنی سمجھنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک کُتّا سخت سی ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی نے اس کی زبان اور ہونٹ زخمی کر دئے جن سے خون نکلنے لگ گیا۔ وہ کتا اس خون کو مزے لے کر چاٹتا تھا اور جی میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ (خون) ہڈی سے نکل رہا ہے حالانکہ وہ خود اپنا ہی خون تھا۔ کہیں باہر سے نہیں آرہا تھا۔

جو روپیہ ہمارے ملک میں ایک جیب سے نکل کر دوسری جیب میں چلا جائے اسے ملک کی آمدنی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ملک کی آمدنی وہ ہے جو کہیں باہر سے آئے۔ جس طرح خوراک اسی کو کہتے ہیں جو باہر سے جسم کے اندر آئے۔ جسم کے خون کا جسم کے اندر گردش کرنا، خوراک (یا غذا) نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی یہ غذا کا کام دے سکتا ہے جس پر جسم کی پرورش کا دارومدار ہے۔ حکومت کی آمدنی جسم کے اندر خون کی گردش کا نام ہے۔ غذا کا نام نہیں۔ حکومت چونکہ ایک بہت بڑا ادارہ ہے اس لئے اس کا نظم و نسق اور آمدنی کا سلسلہ ذہن میں نہیں آتا۔ اسے سمجھنے کے لئے آپ اپنے قصبہ کی میونسپلٹی کو سامنے لائیے۔

میونسپل کمیٹی کی مثال

یہ میونسپلٹی چونگی وصول کرتی ہے۔ کن سے۔ شہر کے لوگوں سے۔ یہ اس میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہے۔ اس آمدنی سے وہ شہر کی سڑکوں، نالیوں وغیرہ کا انتظام کرتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ چونگی کی آمدنی، میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہوتی ہے یا آپ کے شہر کی آمدنی۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ وہ کمیٹی کی آمدنی ہے۔ شہر کی آمدنی نہیں۔ اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ کسٹم، سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ سب حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں۔ ملک کی آمدنی کی نہیں۔

یہاں سے لازماً یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں تو ملک کی آمدنی کون سی ہوگی ملک کی آمدنی وہ ہوگی جو ملک کے اندر کہیں باہر سے آئے۔

مُلک کی آمدنی

باہر سے کیسے آئے؟ اس طرح کہ (مثلاً) جاپان کو گندم کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس فاضل گندم ہو. ہم یہ گندم جاپان کے ہاتھ فروخت کر دیں. اس گندم کی قیمتِ فروخت ہمارے ملک کی آمدنی ہو گی. اس لئے کہ یہ رقم باہر سے آئی ہے. لیکن ہم گندم کو باہر اسی صورت میں بھیج سکیں گے جب یہ ہماری اپنی ضرورت سے زائد ہو. اگر ہمارے ہاں گیہوں اتنا ہی پیدا ہوتا ہو جتنے کی خود ہمارے ملک کو ضرورت ہے، تو ہم باہر کیا بھیجیں گے؟ لہٰذا ہمارے ہاں گیہوں اتنا پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم، ملک کی ضروریات پورا کرنے کے بعد، دوسرے ملکوں کو بھی بھیج سکیں جس سے ہمارے ملک کو آمدنی ہو سکے. آپ پوچھیں گے کہ ہمارے ملک کو اس آمدنی کی ضرورت کیا ہے؟ اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ جس طرح جاپان کو ہمارے ہاں سے گیہوں خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے، ہمیں بھی دوسرے ملکوں سے کچھ نہ کچھ خریدنا پڑتا ہے. (مثلاً دوائیاں. مشینری وغیرہ) یہ چیزیں اسی آمدنی سے خریدی جا سکتی ہیں.

زمین کی پیداوار

لہٰذا بات سمٹ کر یہاں آگئی کہ کسی ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو اس ملک کی زمین سے پیدا ہو. اگر وہ پیداوار اتنی ہے کہ جس سے خود اس ملک کی اپنی ضروریات بھی پوری نہیں ہو سکتیں تو اس ملک کو روٹی بھی دوسروں سے خریدنی یا مانگنی پڑے گی. اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اس ملک کی اپنی ضروریات ہی پورا کر سکتی ہے تو اسے دوسری چیزیں باہر سے نہیں مل سکیں گی. لیکن اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اپنی ضروریات پورا کر لینے کے بعد اسے باہر بھی بھیج سکتا ہے (خواہ خام شکل میں یا مصنوعات کی صورت میں) تو اس ملک کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہے گی. اس ملک کو فی الحقیقت خوشحال ملک کہہ سکیں گے

لہٰذا کسی ملک کی زندگی اور خوشحالی کا راز

زمین

میں ہے. خوش بخت ہے وہ ملک جس کے پاس زمین کافی ہو. جن ملکوں کے پاس زمین نہیں، زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ مغربی ممالک سے لگایئے. مثلاً انگلستان کو لیجئے. اسے اپنی خوراک کا بیشتر

جن کے پاس زمین نہیں

حصہ باہر سے منگانا پڑتا ہے. اس کے لئے اس نے پہلے تو یہ کیا کہ دُور دراز ملکوں میں اپنی نوآبادیات قائم کیں. ان آبادیوں سے اس نے خام پیداوار حاصل کی. پھر اپنے ہاں ایسی چیزیں تیار کرنا شروع کیں جن کی

دوسرے ممالک کو ضرورت تھی. پھر ایسی منڈیاں تلاش کیں جن میں ان مصنوعات کی کھپت ہو. لیکن یورپ میں اور ایسے ممالک بھی تھے جنہیں اپنی مصنوعات کے لئے انہیں منڈیوں کی ضرورت تھی. ظاہر ہے کہ جب منڈیاں تھوڑی ہوں اور مال بیچنے والے زیادہ' تو اُن میں باہمی کشمکش ہو گی. یہی وہ کشمکش ہے جو دنیا میں اس قدر خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا موجب بنی رہی ہے. لیکن آپ سوچئے کہ جن ملکوں کو اس وقت ان مصنوعات کی ضرورت ہے اگر وہ انہیں خود اپنے ہاں تیار کرنے لگ جائیں تو پھر ان ممالک کا حشر کیا ہو جن کی زندگی کا دارومدار ان مصنوعات کی فروخت پر ہے. اس سے آپ نے پھر دیکھ لیا کہ کسی ملک کی زندگی اور خوشحالی کا راز

ارض یعنی زمین

میں ہے. بالفاظِ دیگر ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو زمین سے باہر آئے' اسی پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے. جس ملک کی زمین کافی غلّہ پیدا کر سکتی ہے وہ ملک کبھی بھوکا نہیں مر سکتا. یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اَرضٌ

ارض کی اہمیت

کو اس قدر اہمیت دی ہے. اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (۱۵/۲۰) ہم نے تمہارے لئے سامانِ زندگی ارض میں رکھا ہے. تمہارے لئے بھی اور ان کے لئے بھی جنہیں تم رزق بہم نہیں پہنچاتے.

جب انسان ابتدائی وحشی زندگی کے بعد تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا تو اس سے کہا گیا کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) تمہارے لئے ارض میں مستقر ہے اور ایک وقتِ معینہ تک سامانِ زیست. تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے بھی مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۷۹/۳۳)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ زمین میں سامانِ زیست کے اس قدر خزانے موجود ہیں کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے. لیکن وہ از خود باہر نہیں نکلتے. وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں یعنی طبعی قوانین کے مطابق باہر آتے ہیں. وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۵/۲۱) اور دوسری جگہ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ (۴۲/۲۷) کہا ہے. یعنی اس کے لئے خدا نے قانون مقرر کر رکھا ہے. اور وہ قانون ایسا نہیں جس کا کسی کو علم نہ ہو. زندہ قوموں میں زراعت کے متعلق نت نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں.

مٹی (SOIL) میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے اور اس میں پیداوار کی صلاحیت اور توانائی بڑھانے کے نئے نئے آلات اور ادویات تیار کی جاتی ہیں. فصلوں کو کیڑوں اور موسموں کی شدت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت مؤثر تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ آب پاشی کے عجیب و غریب ذرائع دریافت کئے جاتے ہیں. حتیٰ کہ اب مصنوعی بادل بھی بن رہے ہیں. یہ تمام کوششیں ان قوانینِ فطرت (بِقَدَرٍ، مَّعْلُوْمٍ یا بِقَدَرٍ، مَا یَشَاءَ) کے مطابق انجام پاتی

قوانینِ فطرت

ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے ہیں کہ زمین کے خزائن کو باہر کیسے نکالا جائے. جو قومیں فطرت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کوشش کرتی ہیں، وہ خدا کی رحمتوں سے نوازی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں رزق کی فراوانی ہوتی ہے. جو ایسا نہیں کرتیں خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جاتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ خدا نے پیداوار کی کمی کو عذاب کہا ہے. سورۂ اعراف میں ہے. وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ....... (۷/۱۳۰) ہم نے فرعون کی قوم پر قحط سالی اور پیداوار کی کمی کا عذاب مسلط کر دیا. دوسری جگہ خود بھوک کو خدا کا عذاب کہا گیا ہے. سورۂ نحل میں ہے. ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا. اللہ تمہیں ایک مثال کے ذریعہ بات سمجھانا چاہتا ہے.

بھوک خدا کا عذاب ہے

قَرْیَۃً ایک بستی تھی. کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً یَّاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ اس کے رہنے والے نہایت امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے. ان کے لئے سامانِ زیست (رزق) ہر طرف سے بافراط چلا آتا تھا. فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ. انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی. اس کے قوانین کی اتباع سے انکار کر دیا. زمین سے جس طرح بافراط رزق حاصل کیا جانا چاہیئے تھا، ان طریقوں کو چھوڑ دیا فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ تو اللہ کے قانون کے مطابق ان پر بھوک کا عذاب مسلط ہو گیا. اس طرح جب وہ روٹی کے لئے دوسروں کے محتاج ہو گئے تو جن سے روٹی ملنے کی توقع تھی، ان کا خوف بھی ان کے دل میں پیدا ہو گیا. وہ ان سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے. ان سے خائف رہتے تھے کہ کہیں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائیں. یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خدا نے ان کی حالت ایسی کیوں کر دی؟ اس کے متعلق کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا نے یونہی خواہ مخواہ ان کی حالت ایسی کر دی. قطعاً نہیں. خدا کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا. یہ سب کچھ ان لوگوں کی اپنی کرتوتوں کا نتیجہ تھا. یہ مصیبتیں ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تھیں بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲).

قرآن کی ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر اپنے ملک کی حالت پر غور کیجئے. ہمارا ملک (سابق پنجاب اور سندھ کی وادی) ساری دنیا میں اناج کی کوٹھی (GRANARY) کے نام سے مشہور تھی. اس میں اتنا غلّہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والے خود بھی بافراط کھاتے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے. اب اسی ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ (پچھلے دنوں ٹنڈو جام میں تقریر کرتے ہوئے امریکی نمائندہ مسٹر جان اوربل نے

ہماری زرعی پیداوار کی حالت

نے بتایا کہ) ہم نے گزشتہ ڈیڑھ سال میں اسّی کروڑ روپے کا غلّہ باہر سے منگایا ہے. آپ نے غور کیا؛ اسّی کروڑ روپے کا غلّہ! ہمارے بجٹ میں سارے سال کی "آمدنی" ایک ارب انتالیس کروڑ دکھائی گئی ہے. ایک طرف اسے رکھئے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ ہم نے ڈیڑھ سال میں اسّی کروڑ روپے کا اناج دوسرے ملکوں سے منگایا ہے.

یہ تو تھی گزشتہ ڈیڑھ سال کی بات. ہماری اسمبلی کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۵۷ء میں وزیرِ خوراک مسٹر دلدار احمد نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ اندازہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں امسال قریب چار لاکھ ساٹھ ہزار ٹن غلّہ کی کمی ہوگی. اس کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی کمی اس اندازہ سے بھی زیادہ ہے. آخری اطلاع یہ ہے کہ ہمیں اس سال قریب پینسٹھ (۶۵) کروڑ روپے کا غلّہ باہر سے منگانا پڑے گا. یعنی ہمارے بجٹ میں سال بھر کی آمدنی کا تخمینہ ایک ارب انتالیس کروڑ روپیہ ہے اور اس میں سے پینسٹھ (۶۵) کروڑ روپے کا غلّہ باہر سے منگانا پڑے گا. یا للعجب!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اگر دوسرے ملکوں سے کوئی چیز منگانی پڑے تو اس کی قیمت ہمارے روپے میں ادا نہیں کی جا سکتی. ان کے سکّے میں ادا کرنی پڑتی ہے جن سے وہ چیز خریدی جائے. ان کا سکّہ ہمیں اسی صورت میں مل سکتا ہے جب ہم ان کے ہاتھوں کوئی اپنی چیز فروخت کریں. ہمارے ہاں دوسروں کے ہاتھ بیچنے کے لئے زمین کی پیداوار ہی ہو سکتی ہے. مثلاً روئی، چائے وغیرہ. لیکن ہم نے گزشتہ دس سال میں جس قدر زرعی پیداوار باہر بھیجی ہے اس سے قریب چار گنا زیادہ قیمت کا غلّہ باہر سے منگایا ہے. آپ سوچئے کہ سوائے اس کے ہم دوسری قوموں سے قرضہ مانگیں یا امداد طلب کریں؛ ہمارے پاس روٹی حاصل کرنے کی اور

سب اپنا پیدا کردہ ہے

کون سی شکل ہے؟ اور یہ سُن کر آپ کلیجہ مسوس کر رہ جائیں گے کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ کسی آسمانی آفت یا زمینی بلا کی وجہ سے نہیں ہوا. یہ سب (قرآن کے الفاظ میں) ہمارے اپنے ہاتھوں کا پیدا کردہ ہے. ہمارے ہاں زمین کی کمی نہیں لیکن

ہماری نااہلی کی حالت یہ ہے کہ اوّل تو ہماری زمین کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس میں کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں قابلِ کاشت زمین قریب ۲۳،۳۴،۳۱،۶۸۰ ایکڑ ہے اس میں سے قریب ۵،۰۵،۵۹،... ایکڑ زمین میں غلہ کی کاشت ہوتی ہے اور ۵،۸۹،... ایکڑ زمین میں سبزیاں ترکاریاں بوئی جاتی ہے۔ یعنی کل رقبہ زیرِ کاشت ۵،۸۱،۴۸،... ہے۔ بالفاظِ دیگر ہماری قابلِ کاشت زمین کا ایک چوتھائی حصہ زیرِ کاشت ہے اور باقی تین چوتھائی زمین غیر آباد ہے۔ اس زیرِ کاشت رقبہ میں سے ۲ لاکھ ایکڑ میں ہم تمباکو کی کاشت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) کسی بھوکے کو ایک روپیہ مل جائے اور وہ اس روپیہ کا جا کر حقہ خرید لائے۔ ہم اپنے زیرِ کاشت رقبہ میں تمباکو کی کاشت کرتے ہیں اور روٹی دوسروں سے مانگ کر کھاتے ہیں! کیا ایسی قوم بھی دنیا میں کہیں اور دیکھی سُنی ہے؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ ہمارا جس قدر رقبہ زیرِ کاشت ہے اس کا کافی حصہ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر جان۔ او۔ بل کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں ہر سال قریب ایک لاکھ ایکڑ زمین بیکار ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی پاکستان میں بارانی رقبہ قریب چالیس فیصد ہے۔ اس میں ہر سال قریب بارہ ہزار ایکڑ زمین ناقابلِ کاشت ہوتی جا رہی ہے۔

تیسری بات یہ کہ جس رقبہ میں کاشت ہوتی ہے اس میں پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۴۸-۴۹ء میں ہمارے ہاں چاول کی پیداوار قریباً گیارہ من فی ایکڑ تھی اور گیہوں کی قریب ساڑھے دس من فی ایکڑ۔ لیکن ۱۹۵۵-۵۶ء میں چاول کی پیداوار کی اوسط قریب نو من رہ گئی۔ اور گیہوں کی قریب آٹھ من فی ایکڑ۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں چاول کی مجموعی پیداوار قریب چوراسی لاکھ ٹن تھی۔ لیکن ۱۹۵۵-۵۶ء میں یہ پیداوار قریب ستتر لاکھ ٹن رہ گئی۔ اسی طرح گیہوں کی مجموعی پیداوار ۱۹۴۸-۴۹ء میں قریب چالیس لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۵۵-۵۶ء میں قریب تینتیس لاکھ ٹن رہ گئی۔ حالانکہ زیرِ کاشت رقبہ دونوں صورتوں (چاول اور گیہوں کے لئے) ۱۹۴۸-۴۹ء کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔ ادھر زمین کی بیکاری اور پیداوار کی کمی کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف ہماری آبادی قریب دس لاکھ نفوس سالانہ کی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔

اس کے مقابلے میں ذرا دوسرے ملکوں کی حالت پر غور کیجئے۔ پہلے اوسط پیداوار کو لیجئے۔

ملک	چاول	نیشکر	گیہوں
۱۔ پاکستان	۱۱ (من)	۳۸۳ من	۸½ من (اوسط پیداوار فی ایکڑ)

۲. جاوا	۱۸	۱۳۳۶	×
۳. جاپان	۴۴	×	۱۹
۴. مصر	۴۳	۶۲۳	۱۹

یہ اس لئے کہ (علاوہ دیگر وجوہات) جاپان میں مصنوعی کھاد کا استعمال قریب ساٹھ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے ہوتا ہے۔ مغربی یورپ میں قریب تین سو پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے اور پاکستان میں صرف ایک پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے۔ حالانکہ اس کھاد کا استعمال ۲۰ سے چالیس فیصدی پیداوار بڑھا دیتا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ

(۱) مغربی یورپ کے پاس ساری دنیا کے رقبۂ زمین کا قریب ۳٪ (تین فیصدی) حصہ ہے اور پندرہ فیصدی آبادی۔ لیکن یہ کُل دنیا کی خوراک کا ایک تہائی حصہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) اس میں اگر روس اور شمالی امریکہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو دنیا کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ ان ممالک میں بستا ہے۔ اور دنیا کی خوراک کا ۲/۳ حصہ ان ممالک میں خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی ۱/۳ حصہ ساری دنیا کے لئے بچتا ہے باقی اس میں سے ایشیا کے حصہ میں ۱۷ فیصدی آتا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر آپ سوچئے کہ ہم کہاں ہیں۔ کدھر جا رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ اول تو یہی چیز قابلِ غور ہے کہ ہمیں ہر سال جس قدر غلّہ کی ضرورت پڑتی ہے اور جسے خریدنے کے لئے ہمارے پاس زرِمبادلہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں قرضہ یا امداد کے طور پر کب تک ملتا رہے گا؟ دوسرے یہ کہ ہمیں جو قرضہ یا امداد مل رہی ہے اس کی ہمیں قیمت کس قدر ادا کرنی پڑ رہی ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال سے نکلنے کی شکل کیا ہے۔ اس کے متعلق کہا یہ جائے گا کہ ہمیں

اس کا علاج

زمین کو بہتر بنانے اور اس کی پیداوار کو بڑھانے کے سوال پر خاص توجہ دینی چاہیئے جس قدر افتادہ زمین ہے اسے قابلِ کاشت بنانا چاہیئے۔ قابلِ کاشت زمین کو بیکار نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ نئے آلات اور ادویات سے مٹی (SOIL) کو زیادہ سے زیادہ تندرست اور توانا بنانا چاہیئے۔ وسائلِ آب پاشی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے اور ان تدابیر کا اختیار کرنا نہایت ضروری۔ لیکن یہ ضابطۂ خداوندی کا صرف ایک پہلو ہے جسے قوانینِ طبعی کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ قرآن کی رُو سے وہ گوشہ بنیادی ہے۔ اس وقت ہماری

حالت یہ ہے کہ ایک ایک زمیندار دس دس ہزار (بلکہ ایک ایک لاکھ) ایکڑ زمین کا مالک ہے اسے اس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ اس کی زمین کی حالت کیا ہے۔ اس کی پیداوار گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔ وہاں سے جو کچھ بھی آجائے اس کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا ہے زمین کاشتکاروں کے پاس ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ اس کے مالک نہیں ہوتے محض مزدور ہوتے ہیں اس لئے یہ اس کے سنوارنے کی فکر نہیں کرتے۔ اور اگر کرنا چاہیں بھی تو ان کے پاس اس کے وسائل ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے کاشتکاروں کی حالت جس قدر قابلِ رحم ہے اس کا

کاشتکاروں کی حالت

اندازہ ہم شہری بمشکل لگا سکتے ہیں۔ ہم پرانے زمانے کے غلاموں کے حالات پڑھ پڑھ کر خون کے آنسو بہایا کرتے ہیں۔ اگر ہم کہیں ان کاشتکاروں کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو نہ معلوم ہم پر کیا گزر جائے۔ ان بے چاروں کو محض شکل وصورت کے اعتبار سے انسان سمجھئے۔ ورنہ ان سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ حیوانات سے بدتر ہے۔ ہمارے ہاں لیبر (مزدوروں) کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا یا کہا جاتا ہے۔ لیکن مزدوروں میں یہ کاشتکار شامل نہیں کئے جاتے۔ ان سے صرف وہ مزدور مراد ہوتے ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی اسّی فیصدی آبادی کاشتکاروں پر مشتمل ہے۔ (اور کل مزدوروں کا ۸۷٪ فیصدی حصہ کاشتکار ہیں) باقی بیس فیصدی میں سے دس فیصدی کارخانوں کے مزدوروں کو سمجھ لیجئے اور دس فیصدی زمیندار، تاجر، کارخانہ دار، ملازمت پیشہ وغیرہ۔ ہم دس فی صدی (کارخانوں کے مزدوروں) کے متعلق تو اتنا کچھ کہتے یا کرتے ہیں لیکن اسّی فیصدی آبادی (کاشتکاروں) کے متعلق کبھی خیال تک بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ مزدوروں کے متعلق قانون موجود ہے کہ ان سے اتنے گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ اور (LIVING WAGE) سے کم اُجرت نہیں دی جا سکتی۔ یعنی انہیں اتنی اُجرت ضرور ملنی چاہیئے جس سے ان کا گزارہ ہو سکے۔ نیز مزدوروں کی صحت، آسائش، تفریح کے لئے بھی قوانین موجود ہیں لیکن بے چارے کاشتکاروں کے متعلق کسی نے کبھی نہیں سوچا کہ انہیں کتنے گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اور سال کے بعد انہیں ملتا کیا ہے۔ نہ کسی کو اُن کی صحت کا خیال ہے نہ آسائش کا نہ مکان کا نہ خوراک کا۔ وہ اپنے بیلوں اور گدھوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور انہیں ان سے بھی کم کھانے کو ملتا ہے۔ آپ سوچیئے کہ جو کاشتکار ان حالات میں کام کریں وہ زمین کو سنوارنے کی فکر خاک کر سکیں گے؟

اب آپ پوچھیں گے کہ خدا کے اس قانون نے، جسے اوپر بنیادی بتایا گیا ہے، ان خرابیوں کا علاج کیا

تجویز کیا ہے؟ اس نے بڑا سیدھا اور صاف علاج تجویز کیا ہے. اس نے کہا ہے کہ زمین تمام انسانوں کے

زمین پر ذاتی ملکیت جائز نہیں

لئے سامانِ زندگی (رزق) حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. جس طرح فضا کی ہوا، سورج کی روشنی، ندی کا پانی، ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے۔ اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ ان پر ذاتی قبضہ جما لے' اسی طرح زمین کے متعلق بھی خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے. کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہونی چاہیئے. سورہ حٰم سجدہ میں ہے. قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ. کیا تم اس خدا (کے قانون) سے انکار کرتے ہو جس نے اس زمین کو دو مراحل میں پیدا کیا. (پہلا مرحلہ وہ تھا جب وہ اس قدر گرم تھی کہ اس میں کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا اور دوسرا مرحلہ وہ جس میں یہ اس قابل ہو گئی کہ اس پر جاندار مخلوق رہنے لگی. اور یہ ان کے لئے سامانِ زندگی بہم پہنچانے لگی). کیا تم اس زمین کے معاملہ میں (جو خالصتہً خدا کی ملکیت ہے) اس کے ہمسر بناتے ہو؟ اس نے زمین کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے. کیونکہ وہ ربّ العالمین (تمام انسانوں کا پرورش کرنے والا) ہے. وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا. اس نے زمین کی سطح پر پہاڑ بنائے (جو اس کے سلسلہ آب رسانی کا اہم ذریعہ ہیں). وَبَارَكَ فِيهَا. اور اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی. وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ اور اس کی پیداوار (فصلوں) کے لئے چار موسم مقرر کئے سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ (۴۱/۹-۱۰) یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے.

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ لوگوں کو زمین کا مالک قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں خدا کا ہمسر بنا رہے ہو. اسی ضمن میں سورۂ بقرہ میں کہا ہے کہ خدا نے تمہارے پاؤں کے نیچے زمین پیدا کی. اوپر آسمانی کرّے بنائے. بادلوں سے پانی برسایا. اس سے فصلیں پیدا کیں تاکہ وہ تمہارے لئے وجہ زیست بن سکیں. اس کے بعد ہے فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۲۲) لہٰذا تم خدا کے ہمسر نہ بناؤ. اگر تم ذرا بھی علم و عقل سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ اس کا کوئی ہمسر ہو نہیں سکتا. سورۂ عبس میں ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے رزق یعنی (خوراک) پر غور کرے اور سوچے کہ اس میں کون سی چیز ہے جو اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے. زمین میں پیداوار کی صلاحیت کا موجود ہونا. بادلوں سے

پانی برسنا۔ اس سے بیج کا پھوٹ کر کونپل بننا۔ کونپل کا بڑا ہو کر پودا بننا۔ پودے میں پھل اور اناج پیدا ہو جانا یہ سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲-۸۰/۲۴) ہونا چاہیئے یعنی تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زندگی۔ نہ یہ کہ لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر اس کے مالک بن بیٹھیں۔ خود عیش اڑائیں اور کاشتکار بیچارے بھوکوں مریں۔

سورۂ واقعہ میں اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارے قانونِ نشوونما کا حصہ کس قدر۔ تم ہل چلا کر زمین میں بیج ڈالتے ہو۔ اس کے بعد۔ ہے۔ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ۔ کیا اس بیج کو فصل میں تم تبدیل کرتے ہو یا ہم تبدیل کرتے ہیں؟ اگر ہمارا قانون اس دانہ کو فصل میں تبدیل نہ کرے تو تمہاری محنت اکارت چلی جائے اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ۔ اس کے بعد پانی کے متعلق بھی کچھ کہا ہے۔ اور پھر آگ کے متعلق۔ اور ان سب کے بعد ہے کہ ہم نے یہ سارا سلسلہ اس لئے قائم کر رکھا ہے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ بن سکے (۷۳-۵۶/۶۴)۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ رزق بن سکے۔ یہ ہے خدا کا وہ قانون جسے اس نے اس سلسلے میں بنیادی قرار دیا ہے۔

دو خدا؟

لیکن وہ کہتا ہے کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم یہ تو مانتے ہو کہ سورج خدا کا ہے۔ اس پر کسی کی ملکیت جائز نہیں۔ ہوا خدا کی ہے۔ یہ ہر ایک کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ چاند اور ستاروں کی روشنی خدا کی ہے۔ اس سے ہر ایک کو مستفید ہونا چاہیئے۔ مگر جب تم زمین کی طرف آتے ہو تو اس کے متعلق کہہ دیتے ہو کہ نہیں! اس پر لوگوں کی ذاتی ملکیت ہونی چاہیئے تاکہ غریب اور کمزور بھوکے مریں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں کا اِلٰہ (حاکم اور مالک) کوئی اور ہے اور زمین کا اِلٰہ کوئی اور۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔ أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ کیا انہوں نے ارض میں اور اِلٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن کے سہارے یہ پھیلنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۲-۲۱/۲۱) اگر ان میں اللہ کے علاوہ اور اِلٰہ ہوتے تو ساری کائنات درہم برہم ہو جاتی۔ اس لئے هُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳/۸۴) آسمانوں میں اِلٰہ بھی وہی ہے اور زمین میں اِلٰہ بھی وہی۔

○

اسلام اور کمیونزم

اس مقام پر بعض لوگ جھٹ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو وہی بات ہے جسے کمیونسٹ پیش کرتے ہیں اس لئے اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہوگئے۔

اس موضوع پر ہم اس سے پہلے متعدد بار تفصیل سے لکھ چکے ہیں جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اگر اتنی سی بات سے (کہ اسلام کی رُو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں اور کمیونزم میں بھی زمین کی ذاتی ملکیت کی نفی ہوتی ہے) اسلام اور کمیونزم کو ایک قرار دے دیا جائے تو پھر شاید دنیا میں کوئی نظریہ اور کوئی نظام بھی ایسا نہ رہے گا جسے اسلام جیسا نہ سمجھ لیا جائے۔ مثلاً:۔

(۱) اسلام میں شراب کی ممانعت ہے۔ اور بھارت کا سیکولر نظام بھی شراب کی ممانعت کرتا ہے۔ اس لئے اسلام اور بھارت کا سیکولر نظام ایک ہی ہوا۔

(۲) اسلام بُت پرستی کو شرک قرار دیتا ہے اور آریہ سماج بھی بُت پرستی کی سخت مخالفت کرتا ہے اس لئے اسلام اور آریہ سماج ایک ہی ہوا۔

(۳) اسلام میں خنزیر حرام ہے اور یہودی بھی اسے نہیں کھاتے اس لئے اسلام اور یہودیت ایک ہی ہوئے۔

(۴) اسلام میں زنا کی ممانعت ہے اور عیسائیت بھی اسے حرام قرار دیتی ہے۔ اس لئے اسلام اور عیسائیت ایک ہی ہوئے۔

غرضیکہ اس قسم کی مشابہت کی باتوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا کوئی نظریہ، عقیدہ یا حکم کسی اور مذہب اور نظام میں بھی پایا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو جاتے کہ اسلام اور وہ مذہب یا نظام ایک ہی ہیں۔ لہٰذا اگر اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں، اور کمیونزم بھی ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا۔ تو ان دونوں میں اس ایک بات کے مشترک ہونے سے اسلام اور کمیونزم ایک نہیں ہو جاتے۔ اسلام صرف اسی ایک سوال کا نام نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

اسلامی فلسفۂ زندگی

اسلام ایک فلسفۂ زندگی ہے، وہ انسان کی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے اندر لیتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے خاص قوانین عطا کرتا ہے۔ یہ قوانین وحیِ خداوندی کی رُو سے عطا ہوئے ہیں اور ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے فلسفۂ حیات کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ (۱) انسانی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے تابع رہنا چاہیئے اور

(ii) انسان کا ہر ایک عمل (بلکہ ارادہ اور خیال تک بھی) اپنا نتیجہ مرتب کرکے رہتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ بُرے کام کا بُرا نتیجہ۔ یہ نتائج اس زندگی میں بھی انسان کے سامنے آتے ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ خدا نے جو اٹل قوانین عطا کئے ہیں ان میں ایک حصہ انسان کی معاشی زندگی سے بھی متعلق ہے۔ ان قوانین کی رُو سے، زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں۔

اشتراکی فلسفہ

اس کے برعکس، کمیونزم بھی محض معاشی نظام کا نام نہیں۔ وہ ایک فلسفۂ زندگی ہے۔ یہ فلسفۂ زندگی، اسلام کے فلسفۂ زندگی کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ کمیونزم کے فلسفۂ زندگی کی بنیاد ان عقائد پر رکھی گئی ہے کہ (i) خدا کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض سرمایہ داروں کا رچایا ہوا ڈھونگ ہے۔ (ii) انسان کی زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت کے بعد کوئی اور زندگی نہیں (iii) جب خدا کا کوئی وجود نہیں تو وحی کا تصور بھی غلط ہے اور (iv) جب وحی کا تصور غلط ہے تو نبوت اور رسالت بھی کوئی شے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کمیونزم اور اسلام کس طرح ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اس قدر متضاد کہ یہ بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص، کمیونزم کے فلسفہ کو مانتا ہوا کسی صورت میں مسلمان نہیں کہلا سکتا کوئی کمیونسٹ مسلمان نہیں ہو سکتا اور کوئی مسلمان کمیونسٹ نہیں بن سکتا۔ اگر کمیونزم کے معاشی نظام کی بعض شقیں قرآن سے ملتی جلتی ہیں تو جو شخص قرآن کے معاشی نظام کو منزل من اللہ مانتا ہے وہ کمیونسٹ نہیں ہو جاتا۔

فریب دہی

یہ غلط فہمی ہمارے سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے پھیلائی جاتی ہے یعنی جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں تو یہ جھٹ سے پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کے مفاد پر زد نہ پڑے۔

لیکن سرمایہ دار طبقہ جانتا ہے کہ ان کی چیخ و پکار سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اب ہر شخص اس حقیقت کو بھانپ لیتا ہے کہ یہ لوگ محض اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر ایسا کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بعض (نام نہاد) مذہبی پیشواؤں کی تائید حاصل کر لی اور انہوں نے خدا اور رسول کا نام لے کر یہ

اربابِ شریعت

کہنا شروع کر دیا کہ شریعت کی رُو سے زمین پر ذاتی ملکیت کی پوری پوری اجازت ہے۔ اور اس پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی چنانچہ ایک طرف جماعت احمدیہ کے امیر مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے "اسلام اور ملکیتِ زمین" کے عنوان سے قریب پونے

تین سو صفحات کی کتاب شائع کر دی. جس میں یہ ثابت کرنے کی (ناکام) کوشش کی کہ اسلام میں زمین پر ذاتی ملکیت بالکل جائز اور درست ہے. دوسری طرف جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے قریب پچھتر صفحات پر مشتمل ایک رسالہ شائع کر دیا جس میں لکھا کہ

> جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ' اتنے مکان' اتنا تجارتی کاروبار' اتنا صنعتی کاروبار' اتنے مویشی' اتنی موٹریں' اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو. اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو. پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم اتنی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جسے تم اجرت یا شرکت کے طریقے کے ذریعے کر رہے ہو. اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں. (ص ۴۳)

یہ فتویٰ قرآنِ کریم کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے اور صاحبِ مضمون نے اس کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت پیش نہیں کی (اگرچہ یہ ایک الگ موضوع ہے. لیکن یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ اسلام نے اس کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ تم جس قدر دولت جمع کرنا چاہتے ہو کرو. قرآن کی رُو سے دولت کے انبار جمع کرنا قطعاً ناجائز ہے. جو حضرات اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں (میری کتاب' نظامِ ربوبیت' ملاحظہ فرمالیں) بہرحال یہ ہے ہمارے ان پیشوایانِ مذہب کا وہ مسلک جسے جاگیرداری اور زمینداری (زمین پر ذاتی ملکیت) کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے. اس کے برعکس قرآن کی تعلیم (گزشتہ صفحات میں) آپ کے سامنے آچکی ہے.

انسانیت کی لعنت

اس کے پیشِ نظر اس امر کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلام میں زمین پر ذاتی ملکیت جائز ہے یا نہیں. تاریخ اس پر شاہد ہے کہ کمزور انسانوں پر بالادست طبقہ نے جو ظلم و ستم روا رکھے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک طاقتور انسان ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھا اور ہزاروں مظلوم اس کی خاطر اپنا لہو پسینہ ایک کر کے زمین میں کاشت کرتے رہے. قرآن نے آکر اس لعنت کو ختم کر دیا اور کہہ دیا کہ زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی

چاہیئے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔

آج پاکستان جن مشکلات سے دوچار ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ملک کی زمین بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت میں ہے اور غریب کاشت کار بھوکے مر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس زمین سے اتنی پیداوار نہیں ہو رہی جتنی ہونی چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیں اور اس باب میں اس کی تعلیم پر عمل کریں۔

○

کرنے کا کام

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ حکومت کے لئے (سردست) کرنے کا کام یہ ہے کہ:۔

(۱) زمین پر بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ساری زمین مملکت کی تحویل میں دے دی جائے۔ حکومت غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا ایک پلان بنائے اور اس پر فی الفور عمل درآمد شروع کر دے۔

(۲) ہر شخص کی تحویل میں (ملکیت میں نہیں بلکہ تحویل میں) اتنی زمین دی جائے جسے وہ خود کاشت کر سکے۔

(۳) حکومت اس زمین کے نقائص دُور کرنے اور اسے توانا اور تندرست بنانے کے لئے ضروری سامان اور اسباب مہیا کرے۔

(۴) حکومت خود فیصلہ کرے کہ کتنے رقبہ میں کس جنس کی کاشت ہوگی۔

(۵) اس رقبہ کی پیداوار میں سے کاشت کرنے والے کی ضرورت کے مطابق اس کے پاس رہنے دی جائے اور باقی جنس کو حکومت مناسب اور معقول قیمت پر خرید لے۔ اس رقم کو اس کاشتکار کی آمدنی قرار دیا جائے۔ اور ملک کے عام انکم ٹیکس کے قاعدے کے مطابق اس آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے مالیہ وغیرہ کچھ وصول نہ کیا جائے۔

(۶) فصلوں کو آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو۔ نیز کاشتکاری یا اس کے مال مویشی کے نقصان کی صورت میں اس کی مناسب امداد کی ذمہ داری بھی۔

(۷) ملحقہ دیہات کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے میونسپل کمیٹی کے انداز سے اہلِ دیہات کی صحت، تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کا یہ وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا

وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۷/۹۶) اگران بستیوں والے خدا کے اس قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتے اور اس کی پوری پوری نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان دروازوں سے جو آمدنی آئے گی اسے کہا جائے گا "ملک کی آمدنی" اور اسی پر ملک کی فلاح و بہبود کا دارو مدار ہو گا۔ فلاح کے تو معنی ہی کھیتی کے ہیں۔

اگر ہم نے یہ کچھ نہ کیا تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہے کہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر کمیونزم کا طوفانِ بلا کہیں اِدھر کا رُخ نہ کرلے۔ اور اس کا کسے علم نہیں کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

نہ صرف یہ بلکہ دین اور انسانیت بھی!

اس سے بچنے کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم خدا کے ضابطۂ قانون کے دامن میں پناہ لیں اور زمین کو ذاتی ملکیت کے پنجوں سے نکال کر ملّت کی مشترکہ تحویل میں دے دیں جو اسے ضرورت مندوں میں حسبِ ضرورت تقسیم کرتی رہے۔ اسی کا نام ہے خدا کی ملک کو خدا کے حوالے کرنا۔

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ
تاز کارِ خویش بکشائی گرہ!

قرآنِ کریم کا معاشی نظام

(تھیاسوفیکل سوسائٹی، کراچی کی تقریر. اگست ۱۹۵۹ء)

○

انسانی بچہ جب دنیا کی فضا میں پہلا سانس لیتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے اور اپنے رزق کے سرچشموں کی طرف لپک کر جاتا ہے. اور جب انسان اس دنیا میں آخری سانس لیتا ہے تو بھی اس کے حلق میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے تاکہ اسے کچھ نہ کچھ توانائی مل سکے. جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس کے حصّے کا رزق ختم ہو گیا تھا. لہذا رزق کا معاملہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے کسی سانس میں بھی بے تعلق نہیں رہ سکتا. انسانی زیست کے لئے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے. یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو آرام سے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا ہے اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی تصوّر کیا جاتا ہے. اور وہ خود بھی ایک ایک سانس میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیا.

انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسان کی اجتماعی زندگی پر غور کیجئے تو اس میں بھی یہی نظر آئے گا کہ قوموں کی تگ و تاز اور جدّ و جہد کے لئے سب سے زیادہ جذبۂ محرّکہ رزق کا سوال ہوتا ہے. رزق کی یہی اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخِ انسانیت کی تعبیر ہی معاشی نقطۂ نگاہ سے کی جا سکتی ہے. جہاں تک سابقہ اقوام کی تاریخ کا تعلق ہے

معاشیات کی اہمیت

مارکس کا یہ نظریہ صحیح ہو یا غلط (اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ذرا

آگے چل کر کی جائے گی)۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے دَور میں اس مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مؤرخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب، تمدّن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت دنیا عملاً جن دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوئی ہے، ان میں کہنے کو تو خطِ امتیاز، نظامِ حکومت ہے ـــــــ یعنی ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت ـــــــ لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف، نظامِ معیشت (ECONOMIC ORDERS) ہی کا نتیجہ ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نکیل ڈالی ہوئی ہے اور وہ انہیں جدھر جی چاہے کشاں کشاں لئے لئے پھر رہا ہے۔

مذہب اور روٹی

انسان نے جب اس اہم مسئلہ کے حل کے لئے مذہب کے دروازے پر دستک دی ـــــ مذہب سے میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب۔ تو اس نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ ہمارا مقصد انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ یہ مادّی دنیا کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس لئے خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے دُور بھاگیں ـــــ لیکن یہ محض فریبِ نفس تھا یا فرار کی راہ۔ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دُور کیوں نہ بھاگے اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے لیکن خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گزارہ ہو نہیں سکتا۔ بھوک، رشیوں منیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ ایشور کے "اوتار" زندہ رہ سکتے ہیں، نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے (انسانوں کے خود ساختہ) "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

اسلام مذہب نہیں بلکہ الدّین ہے جس کے معنی ہیں نظامِ زندگی یا ضابطہ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعوٰے ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے اور جو ضابطہ حیات انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے راہ نمائی دینے کا مدعی ہو وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے؟ وہ روٹی کے سوال سے، کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے۔ اور اس کا ایسا حل بتایا ہے جو ان پریشانیوں کو نہایت آسانی سے دُور کر دیتا ہے

قرآن اور روٹی کا مسئلہ

جو انسان کو جہنم کی آگ کے شعلے بن کر چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس، سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے۔ اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو اس پر خدا کا غضب ہے۔ سورۂ نحل میں ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (۱۶/۱۱۲) خدا تمہیں ایک مثال دے کر بات سمجھاتا ہے۔ (مَثَلًا) قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ ایک بستی تھی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ۔ اس نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکرگزاری کی۔ تو ان کے اس جرم کی پاداش میں فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲) اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں میں اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو مرنے کے بعد جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزہ چکھتا ہے۔ مرنے کے بعد کے جہنم اور جنت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآنِ کریم قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے (روگردانی کرنے) کا جو عذاب بتاتا ہے

معیشت کی تنگی

وہ اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴) (یاد رکھو) جو کوئی میرے قانون سے روگردانی کرے گا۔ تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی

سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ رزق کی تنگی (بھوک کا عذاب) ہے۔

آپ نے بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہوگا کہ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انہیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی۔ پہننے کو کپڑا نہیں ملتا۔ مفلسی، تنگ دستی، بے کسی، بے چارگی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ وہ اس دنیا میں بڑی عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عاقبت اتنی ہی زیادہ تابناک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث بھی رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (مثلاً جنگ کے زمانہ کی تکالیف اور مصیبتوں سے کون واقف نہیں جن میں بڑی بڑی خوشحال اور دولت مند قومیں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں؟) لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ لیکن اگر عسرت اور زبوں حالی کسی فرد یا قوم کی زندگی

دنیا اور آخرت میں عذاب

کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔ یہ چند روزہ (دنیاوی زندگی) کے مصائب ہیں۔ اس کے بعد، (آخرت کی زندگی میں) تمام خوشگواریاں اور سرفرازیاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی)۔ تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) "اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی سے اعراض کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے، زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے اُس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ اس لئے جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں رسوا کُن اور ذلت انگیز

عاقبت کا اندھا

ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور مسرت آمیز نہیں ہو سکتے۔ اس باب میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

اقبالؒ کے الفاظ میں۔

جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا

جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہوگی' یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی ہے. اگر اسے سامانِ زیست کی فراوانی نصیب نہیں. اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں ماخوذ ہے. اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر جھولی پھیلانے کے لئے مجبور ہے' تو اس قوم کو عاقبت کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں. یاد رکھئے قرآن کی رُو سے جنّت اور جہنّم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے. قرآن نے انسان کی سرگذشت کو "قصہ آدم" کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے. وہ اس میں بتاتا ہے کہ جب آدم جنّت میں تھا تو اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۝ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۝ (۲۰/۱۱۸) تجھے یہاں یہ میسر ہے کہ تو اس زندگی میں بھوکا نہ رہے نہ ننگا نہ پیاسا رہے اور نہ ہی دھوپ میں."

جنّت کی زندگی

یعنی اس جنّت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی (روٹی، پانی، لباس، مکان) سے محروم نہیں تھا اس میں "آدم اور اس کی بیوی" سے کہہ دیا گیا تھا کہ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) تم اس میں سے جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ (پیو) یعنی اس میں ہر ایک کے لئے' ہر جگہ' بافراط سامانِ رزق موجود تھا. یہ تھی وہ جنّتِ ارضی جو انسان کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اس سے چھن گئی. اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی. اور اس سے کہہ دیا گیا کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) سو جب تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آئے. سو جو میری راہ نمائی کا اتباع کرے گا' تو نہ اس کی کوشش رائگاں جائے گی اور نہ ہی وہ (سامانِ زندگی) سے محروم رہے گا. (اور نہ ہی ان کے حصول کے لئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی).

فرزندانِ آدم کے لئے' اس زمین پر' اسی جنّت کی دوبارہ تشکیل قرآن کا مقصود و منتہیٰ ہے. اسے قرآنی نظامِ ربوبیت یا (QURANIC SOCIAL ORDER) کہتے ہیں. قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ

قرآن کا مقصود

قرآنی نظامِ ربوبیت قائم کس طرح ہوتا ہے اور اس میں انسان کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی رُو سے روٹی کے مسئلہ کا حل مقصود بالذات ہے۔ یا یہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے اسی بنیاد پر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی پوری پوری عمارت استوار ہوتی ہے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

زندگی کا ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کھاپی کر بڑا ہوتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے تاکہ کھانے پینے کا سامان حاصل کر سکے۔ شادی کرتا ہے۔ صاحبِ اولاد ہوتا ہے۔ اولاد کو کمانے کے قابل بنا دیتا ہے، اور مرجاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے تو پھر ایک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ کچھ ہر حیوان کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ اپنی نسل بڑھاتا ہے اور مرجاتا ہے۔ قرآن اس زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ وَ النَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ ﴿۴۷/۱۲﴾ اور جو لوگ کفر کرتے ہیں، وہ (متاعِ زندگی سے) فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاپی کر مرجاتے ہیں ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔" اس کے برعکس دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد، اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ جس سے ایک فرد، اس دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوعِ انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر افراد، روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہوں تو وہ انسانی سطح کی زندگی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیئے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں، حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظامِ ربوبیت، افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے آتا ہے

حیوانی سطح کی زندگی

انسانی سطح کی زندگی

اسلامی معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتا ہوا جس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وہ وجود

رزق کی ذمہ داری

میں آتا ہے، تمام افرادِ معاشرہ سے پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

یہ ذمہ داری، صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام ذی حیات کو محیط ہوتی ہے، اس لئے کہ جس خدا کے نام پر یہ مملکت قائم ہوتی ہے اس کا اعلان ہے کہ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "روئے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو"۔ اللہ کی یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے ہاتھوں کس طرح پوری ہوتی ہے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے فرمائیے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم

عمرؓ سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت (بلکہ اس حدود میں بسنے والے تمام جانوروں تک) کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لیتی وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح سے کر سکتی ہے؟ قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس مملکت نے خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر پر لیا ہے، رزق کے سرچشمے اور وسائلِ پیداوار، جو خدا کی ملک ہیں، اس مملکت کی تحویل میں چلے جائیں گے

رزق کے سرچشمے مملکت کی تحویل میں

تاکہ وہ ان کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی نظامِ ربوبیت میں، رزق کے سرچشموں پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ افراد کی اور نہ مملکت کی — مملکت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ رزق کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت ارض (زمین) کو حاصل ہے جس سے نہ صرف اناج پیدا ہوتا ہے بلکہ تمام مصنوعات کے لئے خام مسالہ بھی دہیں سے برآمد

ہوتا ہے۔ ارض کے لئے قرآن نے کہہ دیا ہے کہ اسے خدا نے مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ (۵۵/۱۰) اس لئے اس کا ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ اس کا پیدا کردہ رزق تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰) اس لئے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی۔ اسے اسی مصرف میں لانا چاہیئے۔ اگر یہ افراد کی ملکیت میں چلی جائے تو اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے معاشرہ کی اجتماعی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۃ الواقعہ میں بڑے دلنشین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا جسے تم بوتے ہو؟ تم اتنا ہی کرتے ہو کہ زمین میں ہل چلاتے ہو۔ اسے کاشت کے قابل بناتے ہو۔ پھر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد سوچو کہ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ کیا اس بیج میں سے پودا تم پیدا کرتے ہو یا ہمارا قانون پیدا کرتا ہے؟ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اگر ہمارا قانون اس کے خلاف چاہتا تو ہم اس کھیتی کو خشک سالی سے چورا چورا کر دیتے اور تم حیرت میں گم ہو جاتے کہ یہ کیا ہو گیا؛ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ فصل تو ایک طرف ہم بیج سے بھی محروم ہو گئے۔

پھر آگے بڑھو۔ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ کیا تم نے اس پانی پر کبھی غور کیا جو تمہارے لئے زندگی کا سامان اور تمہاری کھیتی کے اُگنے کا ذریعہ بنتا ہے؟ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ کیا اسے بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ اگر ہمارا قانون دوسری طرح چاہتا تو ہم اسے (ایسا) کھاری بنا دیتے جسے تم نہ پی سکتے اور نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اُگ سکتیں۔ سو تم اس کے قدر دان کیوں نہیں ہوتے؟

اور آگے بڑھو۔ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ کیا تم نے اس آگ پر کبھی غور کیا جسے تم جلاتے ہو۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ کیا اس درخت کو جس سے آگ کا سامان ملتا ہے، تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

ذرا سوچو کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس میں تمہارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ

ہیں (نَحْنُ جَعَلْنَا تَذْكِرَةً) اس سے سبق حاصل کرو۔ یہ سبق کہ یہ سب کچھ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ تم اس میں صرف محنت کرتے ہو۔ اس لئے اس کھیتی میں تمہارا حصہ تمہاری محنت کے بقدر ہے، باقی سب کچھ ہمارا ہے۔ اسے ہم نے مَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ (۳۔ ۶۹/۵۶) بھوکوں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔ اس لئے اس فالتو رزق کو ان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ سارے کا سارا اپنی ملکیت نہ سمجھ لو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، غور کرو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

(بالِ جبریل)۔

جو کچھ قرآن نے یہاں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے وہی کچھ دوسرے مقامات پر عام دولت کے متعلق بھی کہا ہے۔ قارون کو قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قارون کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (۲۸/۷۸) میری تمام دولت میری اپنی ہنرمندی کی وجہ سے ملی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹/۴۹) یہ ذہنیت بڑی غلط نگہی اور گمراہی پر مبنی ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ جو کچھ انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس میں کتنے ایسے عنصر عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں انفرادی طور پر اسے کچھ دخل نہیں ہوتا مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، ماحول کے اثرات، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع (OPPORTUNITIES) کا ملنا وغیرہ۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا اصولی پہلو۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے، قرآن اسے نہایت عمدگی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب افراد کی تمام ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان و ذرائع

فرد اور مملکت کا معاہدہ

کی فراہمی کی ذمہ داری مملکت اپنے سر لے لے تو دولت کا افراد کی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں افراد اور مملکت میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر لیکن جامع الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱) افرادِ معاشرہ' اپنی جان اور مال اللہ (یعنی اس مملکت) کے سپرد کر دیتے ہیں (جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے) اور مملکت انہیں الجنۃ کی ضمانت دے دیتی ہے۔ الجنۃ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک اس دنیا میں جنتی زندگی کا تعلق ہے اس میں تمام سامانِ زیست اور ضروریاتِ زندگی بافراغت ملتی چلی جاتی ہیں۔ افراد اور مملکت کا یہ معاہدہ یوں ہی ذہنی طور پر نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کا ممبر وہی بن سکتا ہے۔ (بالفاظِ دیگر مسلمان وہی ہو سکتا ہے) جو برضا و رغبت بغیر کسی قسم کے جور و اکراہ کے' اس معاہدہ پر دستخط کرے۔ اس معاہدہ کی رُو سے ہر فرد اپنے محنت کے ماحصل سے اپنے پاس صرف اتنا رکھ سکتا ہے جتنے میں اس کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھتا ہے اور مملکت کے فیصلے کے مطابق صرف کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس قدر دوسروں کے لئے دے دیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ اس طرح قرآن' فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضلہ دولت پر ہے۔

اس مقام پر وہ سوال سامنے آتا ہے جس کا (بظاہر) کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا اور جسے نظامِ سرمایہ داری (CAPITALISTIC SYSTEM) کی تائید میں بطور دلیلِ محکم پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وہ بھنور ہے جس میں روس کے معاشی نظام کی کشتی بُری طرح پھنس رہی ہے اور اسے اس میں سے نکلنے کی کوئی تدبیر وہاں کے اربابِ حل و عقد کے ذہن میں نہیں آتی۔ سوال یہ ہے کہ جب افرادِ معاشرہ

جذبۂ محرکہ

کو یقین ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں' ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں گی۔ انہیں اس کا بھی پتہ ہو کہ وہ کتنا ہی کام کیوں نہ کریں' ان کی ضروریات سے زائد دولت ان کے پاس رہ نہیں سکتی۔ تو اوّل تو وہ کام ہی کیوں کریں؟ اور اگر ان سے کسی طرح کام بھی لیا جائے تو وہ پوری محنت سے کام کیوں کریں؟ جس دولت کے متعلق وہ جانتے ہوں کہ ان

کے پاس نہیں رہ سکتی، وہ اس کے حصول کے لئے جان کیوں کھپائیں؟ لہٰذا اس قسم کے نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ محنت سے جی چرائیں گے۔ اور ملک کی پیداوار اور قومی دولت روز بروز کم ہوتی جائے گی۔ روس اس وقت اسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کمیونزم نے غریبوں اور مزدوروں کو یہ کہہ کر انقلاب کے لئے ابھارا کہ تم اٹھو اور دولت مندوں سے ان کی دولت چھین لو۔ لیکن جب یہ مرحلہ گزر گیا اور جن دولت مندوں کے خلاف عوام کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی گئی تھی وہ باقی نہ رہے تو عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب وہاں کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں ملتا جو عوام کو جاں فروشانہ طور پر محنت پر آمادہ کر سکے۔ کمیونزم کی یہی بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے نظامِ سرمایہ داری کے حامل یہ کہتے ہیں کہ جب تک افراد کو اس کا یقین نہ ہو کہ وہ جو کچھ کمائیں گے ان کی ملکیت میں رہے گا، وہ کبھی پوری محنت سے کام نہیں کرینگے لہٰذا نظامِ سرمایہ داری ہی قابلِ عمل نظام ہے۔ کیونکہ اس میں (PRIVATE ENTERPRISE) کی عام اجازت اور حدود فراموش وسعت ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو نظامِ سرمایہ داری کا یہ کہنا کہ اس میں افراد کی ساری دولت افراد کی ملکیت رہتی ہے، فریب اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں، کمیونزم محنت کشوں سے زائد دولت براہِ راست چھینتی ہے۔ کیپٹل ازم کا نظام زائد دولت مختلف قسم کے (TAXES) کے ذریعہ کھینچ لیتا ہے۔ استبداد دونوں جگہ کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ اشتراکی نظام میں محنت کش اپنی فاضلہ کمائی، برضا و رغبت اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں۔ نہ نظامِ سرمایہ داری میں لوگ بطیبِ خاطر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس کی رُو سے افراد زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور اپنی فاضلہ کمائی برضا و رغبت نظام کے حوالے کر دیں؟ پروفیسر (HAWTREY) نے کہا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے[1]

یہ جذبۂ محرکہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔

قرآنی جذبہ محرکہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ جسم کی

---

[1] (QUOTED BY E.H.CARR IN THE NEW SOCIETY P. 60)

پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں ایک فرد خود کھاتا یا استعمال کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسروں کو کھلاتے جائیں اور جسم آپ کا تنومند و توانا ہوتا جائے۔ لیکن' اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما کے

انسانی ذات کی نشوونما کا قانون

لئے قانون یہ ہے کہ ایک فرد کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔ لہٰذا جس قدر کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا جائے گا اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی کا مقصود' اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے گا اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے گا۔ ایسے شخص سے محنت کرانے کے لئے ڈنڈا یا ہنٹر تو ایک طرف' کسی وعظ یا نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ نیز وہ جو کچھ دوسروں کو دے گا اس کے لئے بدلہ یا معاوضہ تو کجا' شکریہ تک کا بھی خواہاں نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ انہیں جو کچھ دیتا ہے خود اپنی ذات کی منفعت کے لئے دیتا ہے۔ ان پر احسان نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب دوسروں کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تمہاری پرورش کے لئے جو انتظام کرتے ہیں تو یہ صرف قانونِ خداوندی کے اتباع میں کرتے ہیں (کہ ایسا کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے) اس کے لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اس قدر بےتاب ہوتے ہیں کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں' خواہ انہیں تنگی ہی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹/۹) کھیتیاں انہی کی پروان چڑھتی ہیں جو مفاد پرستانہ جذبات سے محفوظ رہیں۔

یہ ہے وہ جماعت جو دنیا میں نظامِ ربوبیت قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے' انہی کو جماعتِ مومنین یا حقیقی معنوں میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں' اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (۵۳/۳۹) انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پیہم محنت اور مسلسل سعی و کاوش

سے انہیں جو کچھ ملتا ہے وہ اس میں سے بقدرِ ضرورت اپنے لئے رکھتے ہیں اور باقی سب مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے خدا کی عالمگیر ربوبیت کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرے۔ اپنی ضروریات کے

ضروریات کا تعین

تعین میں بھی وہ اسراف سے کام لیتے ہیں نہ تبذیر سے۔ یعنی نہ ضرورت سے زائد خرچ کرتے ہیں، نہ بلا ضرورت دولت ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۶/۱۴۲) "خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" اور اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷/۲۷) "دولت ضائع کرنے والے شیاطین کے بھائی بند ہیں"۔

یہ ہے وہ معاشی نظام جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام میں آپ دیکھئے کہ نہ صرف انسان کا معاشی مسئلہ ہی نہایت اطمینان بخش طریق سے حل ہو جاتا ہے بلکہ انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کا بھی خود بخود استیصال ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی ضروریاتِ زندگی خود بخود پوری ہوتی جائیں گی، تو کوئی شخص ان ناپسندیدہ کاموں کے لئے تیار نہیں ہوگا جو اسے موجودہ غلط معاشرے میں محض روٹی کی خاطر کرنے پڑتے ہیں اور جب وہ فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا تو اسے بددیانتی، چور بازاری، نفع خوری، سمگلنگ، فریب دہی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اُس وقت نہ زمیندار اور کاشتکار کے جھگڑے ہوں گے نہ مزدور اور کارخانہ دار کے تنازعے۔ نہ صاحبِ جائداد اور کرایہ دار کے مناقشات ہوں گے نہ گاہک اور دکاندار کے قضیئے۔ اُس وقت نہ تقسیمِ وراثت کی مقدمہ بازی ہوگی، نہ لین دین کی ٹکا فضیحتی۔ اُس وقت ہر شخص ضروریاتِ زندگی سے بے نیاز ہوگا اور اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحب! یہ محض حسین خواب (UTOPIA) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ اس قسم کا معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آپ اس جذبے کو اس

حسین خواب

کے دل سے نکال نہیں سکتے۔ انسان کبھی ایسے نیک نہیں بن سکتے، جیسی کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ انسان شروع سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا ہی رہے گا۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ انسان بدفطرت نہیں ہے۔ اس کی درحقیقت کوئی فطرت

ہی نہیں. فطرت، جمادات وحیوانات کی ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں. اگر ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کردو تو وہ اچھا انسان بن جائے گا. ان کی غلط تربیت کردو تو وہ بُرا انسان ہو جائے گا. ہم غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں. اس میں انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت غلط خطوط پر کرتے ہیں. جب اس قسم کے معاشرے پر دو چار صدیاں گزر جائیں تو ظاہر ہے کہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے اس میں اسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جائیں گے. ہم اس قسم کے خود غرض اور بدنیت انسان پیدا تو خود کرتے ہیں لیکن (خود بری الذمہ ہونے کے لئے) کہہ دیتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے. اگر ہم اپنے

خواب نہیں حقیقت

بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصوراتِ زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک کرتے جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ قرآن، نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے، ان افراد کی

عملی طریق

تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لاینفک) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے. وہ کہتا یہ ہے کہ تم اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بناؤ اس کے ساتھ ہی تم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت شروع کر دو. جوں جوں ان آنے والی نسلوں کا قلب و دماغ صحیح (قرآنی) قالب میں ڈھلتا چلا جائے اس نظام کو بتدریج آگے بڑھاتے جاؤ. تاآنکہ یہ اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے.

قرآن چونکہ انسانی زندگی کے ہر دَور کے لئے راہ نمائی دیتا ہے اس لئے اس نے جہاں اس منزل کا پورا

عبوری دَور کے احکام

پورا تعارف کرا دیا ہے. جہاں پہنچ کر نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے وہاں اس نے عبوری دَور (TRANSITORY PERIOD) سے متعلق بھی احکامات و ضوابط دے دیئے ہیں. جس سے گزر کر یہ بتدریج آخری منزل تک پہنچتا ہے. اس (عبوری) دَور کے احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں. چنانچہ قرآن میں صدقات و خیرات کی ترغیب، بخل اور حرص کی مذمت، ربوٰی کی ممانعت زراندوزی کی مخالفت، وراثت کے احکام. سب اس عبوری دَور سے متعلق ہیں. کہیں اس کا ارشاد ہے کہ

وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ؕ (۹/۳۵) "جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے

توانہیں دردناک عذاب سے آگاہ کردے۔" اور کہیں وہ کہتا ہے کہ تمہاری تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ (۸۹/۱۹-۲۰) تم وراثت کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دولت سے اس قدر محبت رکھتے ہو کہ چاہتے ہو کہ سب کا مال تمہارے ہی پاس آجائے۔" کہیں وہ کہتا ہے کہ تباہی ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ذہنیت یہ ہے کہ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (۸۳/۲-۳) "جب وہ دوسروں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔" کہیں وہ مالیات کے مشیروں سے کہتا ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح نہ کرو۔ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ (۵۹/۷) کہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی ہے۔ اور کہیں قارون صفتوں سے کہتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ جس قدر مال و دولت تمہارے پاس جمع ہو رہا ہے اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ (۲۸/۷۸) یہ سب ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس پر ہمیں کامل تصرّف حاصل ہے کہ جس طرح جی چاہے اسے صرف کریں! قرآن کے یہ احکام وضوابط اپنی اپنی جگہ مستقل راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ لیکن جب نظامِ ربوبیت اپنی مکمّل شکل میں قائم ہوتا ہے تو اس میں چونکہ ضروریات ہر ایک کی پوری ہو جاتی ہیں اور فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی نہیں اس لئے اس وقت اس جماعت (یا معاشرہ) کے لئے عبوری دَور سے متعلق احکام کی ضرورت نہیں رہتی۔ جس طرح پانی مل جانے پر تیمم کے قرآنی حکم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح قرآن بتدریج اس نظام کو ان افراد کے ہاتھوں قائم کرا دیتا ہے جو صحیح تعلیم و تربیت سے اسے چلانے کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔

○

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر ایسی جماعت پیدا نہ ہو جو اس نظام کے قیام کے لئے کوشش کرے، تو قدرت چپکی بیٹھی مُنہ دیکھتی رہتی ہے۔ دنیا میں غلط نظامہائے زندگی کی تخریب، اور ان کی جگہ صحیح نظام کے قیام کے لئے خدا کا کائناتی قانون اپنے طور پر مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اسی کو کشمکشِ حق و باطل

کائناتی قانون

کہا جاتا ہے، جو کائنات میں مسلسل جاری و ساری رہتی ہے۔ اس میں باطل کی شکست اور حق کا غلبہ لازمی ہوتا ہے لیکن اس کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ قرآن کے الفاظ میں 'اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے

یہ اسی کائناتی قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے جس کی رُو سے (مثلاً) قرآن کہتا ہے کہ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ وَ اللّٰہُ یَحۡکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکۡمِہٖ ؕ وَ ہُوَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۳/۴۱﴾ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں. ان معاملات کے فیصلے خدا (کا قانون) کرتا ہے. اس کے فیصلے (کو ردّ کرنا تو ایک طرف اس) پر نظرِ ثانی کرنے کا بھی کسی کو اختیار نہیں. وہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے" لیکن، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کا "بہت جلد حساب کرنا" بھی ہمارے حساب و شمار سے سینکڑوں برس لے لیتا ہے. لیکن اگر انسان چاہے کہ خدا کا یہ قانون، ہمارے حساب و شمار کے مطابق نتائج مرتب کرلے تو اس کا طریق یہ ہے کہ انسان اس قانون کے ساتھ تعاون کرے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے اس کا دست و بازو بن جائے. انسان اگر اس طرح خدا کے قانون کی مدد کرے گا تو اس کا قانون خود انسان کا ممد و معاون بن جائے گا. اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ (۴۷/۷) کے یہی معنی ہیں. اس طرح، غلط نظام کی صفیں دنوں میں اُلٹ جائیں گی اور اس کی جگہ صحیح نظام کی بساط بچھتی چلی جائے گی. نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاءؓ کی جماعت نے یہی کیا تھا. جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند دنوں کے اندر ایک ایسا محیرّ العقول انقلاب برپا ہو گیا جس کی مثال چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے اسباب و علل معلوم اور متعین کرنے کے سلسلے میں دنیا بھر کے مورّخ آج تک انگشت بدنداں ہیں. اس کے بعد مسلمانوں نے اس قانون کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسی نظامِ زندگی کو اختیار کر لیا جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا تو خدا کا کائناتی قانون پھر اپنی رفتار سے چلنے لگ گیا. یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے. آپ

دُنیا از خود اِدھر آ رہی ہے

اس ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کس طرح انسان اپنے ناکام تجارب کے بعد رفتہ رفتہ، غیر محسوس طور پر، قرآنی نظامِ زندگی کے مختلف اجزاء کو اپنائے چلا آ رہا ہے. لیکن اس تبدیلی کی رفتار بہرحال سُست ہے. میری کوشش یہ ہے کہ ہم اس خطۂ زمین میں جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ ہم یہاں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں، خدا کے کائناتی قانون کی رفاقت کا فریضہ سر انجام دیں تاکہ اس کے

میری کوشش

نتائج، ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں. اس کے لئے پہلا قدم یہ تھا کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن

کا جو تصورِ زندگی کتنے عرصے سے نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آجائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، میں نے اپنی تمام مساعی کو اس نقطہ پر مرکوز کر رکھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا مجوزہ آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم قدم، قرآنی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لے جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھئے گا کہ غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح، کشاں کشاں اس نظام کے حیات پرور سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح پھر یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (۱۱۰/۲) کا کیف آور منظر وجہ بالیدگیٔ قلب ونظر ہو جاتا ہے۔ وَ اَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا (۳۹/۱۹) زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی) کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آجاتی ہے۔

جو لوگ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوشش کریں کہ آئینِ پاکستان اس نظام کا مظہر ہو اور مملکتِ پاکستان، تمام افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے کہ

نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاہُمۡ (۶/۱۵۳)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

استفسارات

تقریر کے بعد سامعین کی طرف سے کچھ سوالات کئے گئے جن کے وہیں جواب دئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سوال: ہم بھوک کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تو پھر ہم بلاقصور عذابِ خداوندی میں مبتلا کیوں کر دیئے گئے ہیں؟

جواب:۔ اجتماعی جرائم اور ان کے نتائج کا سلسلہ انفرادی غلطیوں کی پاداش سے مختلف ہے۔ ایک قوم غلط نظام قائم کرتی ہے یا غلط روش اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذلت اور پستی،

بھوک اور افلاس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے' اس کا یہ عذاب آیندہ نسلوں تک برابر جاری رہتا ہے. یعنی اس قوم کی ہر نسل شروع ہی سے بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے. یہ اس نسل کی پیش رو نسلوں کے اجتماعی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اس نسل کو بھگتنا پڑے گا. بعینہٖ جس طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اچھے کام کرتی ہے تو وہ قوم خوشحال ہو جاتی ہے. اور اس کے بعد اس کی آنے والی نسلیں خوش حال پیدا ہوتی ہیں. انفرادی طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے کہ تندرست ماں باپ کا بچہ پیدائشی طور پر تندرست ہوتا ہے اور جس بچے کے والدین کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں اسے وہ مرض پیدائش کے ساتھ (وراثت میں) مل جاتا ہے اور وہ عمر بھر اس کا دُکھ سہتا رہتا ہے. جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کے لئے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہماری سابقہ نسلوں نے غلطی کی اور اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں. ہم نے (تشکیلِ پاکستان کے بعد) خود غلط نظام قائم کیا اور ہم سے ملی جرائم بھی مسلسل سرزد ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہیں. لہذا ہمارے قصے میں تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہم بلا قصور عذابِ خداوندی میں مبتلا ہیں. البتہ اگر ہم نے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ہم اپنے اسلاف کے جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں.

یہ ہے اجتماعی جرائم کا فلسفہ. یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "قومیں" جہنم میں داخل ہوتی ہیں (دیکھئے سورۃ اعراف. آیت ۳۸).

۲. سوال:۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی سابقہ نسلوں کے جرائم کی پاداش میں بھوک کے عذاب میں گرفتار ہیں. لیکن اس سے ہماری عاقبت کیوں خراب ہو؟

جواب:۔ اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہے اور اس عذاب سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو ہمارے اس جرم کی پاداش میں ہماری عاقبت خراب ہوگی. لیکن اگر ہم نے یہاں صحیح نظام قائم کرنے کی کوشش کی تو پھر ہماری عاقبت خراب نہیں ہوگی. خواہ یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو جائے یا اس کے بعد. اگر یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہوگیا تو ہماری یہ زندگی بھی خوش حال ہو جائے گی اور اگلی زندگی بھی سرسبز و شاداب. لیکن اگر یہ نظام ہمارے بعد قائم ہوا تو ہم بے شک عُسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مر جائیں گے لیکن ہماری اگلی زندگی شاداب ہوگی. اور ہماری آنے والی نسل کی زندگی خوش حال.

اگر انہوں نے اس نظام کے استحکام کے لئے کوشش کی تو اس دنیا کی خوش حالی کے ساتھ، ان کی اُخروی زندگی بھی شادکام ہو گی. لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی موجودہ زندگی تو آسانی سے گزر جائیگی. لیکن آخرت تباہ ہو جائے گی.

۳. سوال :- آپ نے کہا ہے کہ جس قوم کی دنیاوی زندگی عسرت اور بدحالی کی ہوتی ہے اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے. اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی میں گزرتی ہے اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے. اقوامِ مغرب کی موجودہ زندگی بڑے عیش و آرام میں گزرتی ہے. کیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح عیش کریں گے؟

جواب :- آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے میں عجلت کی ہے. صورت یہ ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کشادگی خدا کے طبعی قوانین سے وابستہ ہے. جو قوم ان قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت کریگی اس کی زندگی خوشحالی میں گزرے گی ـــ وہ قوم مسلم ہو یا غیر مسلم ـــ قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں خدا کسی میں تفریق نہیں کرتا. كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ‎(۱۷/۲۰)‏ جو چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے مفت عطا کی ہیں ـــ یعنی سامانِ رزق ـــ وہ زمین کے دسترخوان پر کھلی پڑی ہیں. جس کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر اٹھالے. جو قوم ان کے حاصل کرنے میں جس قدر محنت کرے گی اسے اسی قدر مل جائے گا. یہ نہیں کہ خدا نے غیر مسلموں کے راستے میں بند لگا دیے ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر انھیں حاصل نہیں کر سکتے.

اس سے ظاہر ہے کہ اس دنیا کی متاع، ہر قوم کو باندازۂ سعی و عمل مل جاتی ہے لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم قوم اس کے لئے محنت کرتی ہے تو اسے دنیا میں خوش حالی نصیب ہو جاتی ہے. جماعتِ مومنین، زندگی کے ہر شعبے میں، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے اس لئے اس کی دنیاوی زندگی یقیناً سرفرازی اور سربلندی کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی نہیں بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے اس کی اُخروی زندگی بھی تابناک ہوتی ہے.

جو غیر مسلم قوم دنیاوی متاعِ زیست کے لئے کوشش کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی خوشحال ہوتی ہے. لیکن چونکہ وہ زندگی کو اسی دنیا تک محدود سمجھتی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانینِ خداوندی پر یقین نہیں رکھتی، اس لئے اس کی اُخروی زندگی ناکام رہتی ہے. اقوامِ مغرب کی یہی

حالت ہے۔ لیکن جو قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرے اس کی دنیاوی زندگی بھی عذاب میں گزرتی ہے اور اُخروی زندگی بھی عذاب ہیں۔ (ہم (بدقسمتی سے اسی شق میں آتے ہیں۔

۴۔ سوال :- کیا اسلامی مملکت کے نظامِ ربوبیت میں غیر مسلموں کا بھی حصّہ ہوگا؟

جواب :- قرآنی نظامِ ربوبیت میں ہر فرزندِ آدم کا حصّہ ہوگا خواہ اس کا مذہب و مشرب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جس ملک میں حالت یہ ہو کہ اگر ایک کتا بھی بھوک سے مرجائے تو اس کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہو' اس میں کسی انسان کی بھوک کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے؟ خدا کی ربّ العالمینی (عالمگیر ربوبیت) انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔

۵۔ سوال :- جب نظامِ ربوبیت میں تمام انسانوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوجائیں تو پھر قرآنی نظام کے سامنے کیا پروگرام ہوگا؟

جواب :- جیسا کہ دورانِ تقریر میں بتایا گیا ہے قرآن کی رُو سے' انسانوں کو بنیادی ضروریات کی پریشانیوں سے اس لئے فارغ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کامل اطمینان اور سکون سے کرسکیں انسانی ذات کی ممکنات' جن کی نشوونما مقصودِ حیات ہے' اتنی وسیع ہیں کہ ہم اس وقت جبکہ ہمیں شعورِ ذات تک بھی نصیب نہیں' اس کا اندازہ نہیں لگاسکتے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ نہ معلوم جب افرادِ انسانیہ کی ذات میں نشوونما ہوگا تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے گی۔

یہ تو رہا انسانی ذات کی نشوونما کا قصّہ۔ ویسے اگر محض بنیادی ضروریات کے پورا کرنے کے پروگرام کو لیا جائے تو وہ بھی اتنی جلدی ختم نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اس نظام کو صرف انسانوں کی ضروریات تک محدود نہیں رکھا اس نے دَآبَّةٍ کہا ہے جس کے معنی ہر ذی حیات یا ہر چلنے والا ہے۔ نیز "دآبۃ" کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ اسی زمین میں نہیں' اجرامِ فلکی میں بھی موجود ہیں (وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲/۲۹) یورپ کے سائنسدانوں کے سامنے صرف اجرامِ فلکی کا مسخر کرنا ہے اور وہاں کے سیاسی مدبّروں کے پیشِ نظر ان جدید دنیاؤں میں اپنی استعماریت کی توسیع لیکن قرآنی نظام ان حالات میں یہ سوچے گا کہ ان اجرام میں بسنے والے "دابہ" کی پرورش کی ذمہ داری بھی اس کے فرائض میں شامل ہوجائے گی۔ کیونکہ اس کے خدا نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کہا ہے اور عالمین میں پوری کائنات آجاتی ہے۔ بہرحال آپ گھبرایئے نہیں' قرآنی

نظام کا پروگرام اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جائے گا کہ آپ کے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہ رہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

۶۔ سوال:۔ پاکستان میں قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

جواب:۔ سب سے پہلے اس فکر کو عام کرنا چاہیئے کہ دین کا مقصود اس نظام کا قیام ہے اور اسلامی مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس فکر کے عام کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے نئے آئین میں یہ بات درج ہو جائے کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات اور ان کی ذات کی نشو و نما کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرنا مملکت کی ذمہ داری ہے۔ جب مملکت اس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لے گی تو اس نظام کا قیام عمل میں آجائے گا اس کے لئے وقت ضرور لگے گا۔ آئین میں اس شق کے شامل ہو جانے سے ہماری منزل کا تعین ہو جائے گا۔ آپ اس فکر کے عام کرنے میں جس قدر کوشش کریں گے اسی قدر اس نظام کے قیام کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔

اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی

(اپریل ۱۹۴۲ء)

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے. لیکن انسان کے بچّے کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے. بچّہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بلاتکلّف باتیں شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا. اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے، بلکہ اس لب ولہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرّک کر رہا تھا اور نقل بھی ایسی مکمّل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچّہ کس خطّہ اور کس قبیلہ سے متعلق ہے. بڑی عمر میں پہنچ کر جو زبان سیکھی جاتے اس میں اہلِ زبان کا سا لب ولہجہ پیدا کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ وہ زبان اس کی مادری زبان ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی. لیکن بچّہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے. اس سے ظاہر ہے کہ بچّہ کا ذہن کس قدر اخاذ ہوتا ہے اور وہ نقوش جو چپکے ہی چپکے اس کے لوحِ قلب و دماغ پر آغوشِ مادر میں منقش ہو جاتے ہیں. کیسے انمٹ اور دیرپا ہوتے ہیں. لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچّہ کے دماغ کی یہ اخاذی اور اثر قبولی صرف زبان ہی تک محدود ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے. دماغ تو بہرحال دماغ ہے. جب وہ حروف و الفاظ اور لب ولہجہ کی حرکات وسکنات سے ایسا متاثر ہوتا ہے تو گرد وپیش کے دیگر احوال وکوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا؟ زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے

آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں، لیکن خیالات کی اثر پذیری بچے کے قلب و دماغ میں غیر محسوس طور پر

وراثتی اور ماحولی اثرات

پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے لیکن اگر ہم اس کا احساس کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں جنہوں نے کرنا چاہا انہوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ تول کر دیکھ لیا. علم تجزیہ نفس کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے. بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیکر ہوتا ہے. اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ محکم چٹانیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریاتِ زندگی اور معتقداتِ حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہوجاتی ہیں. یہ اثرات جب توارث و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئیں تو ان کی ابتدا کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے لئے یہی چیزیں صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتی ہیں جنہیں اس قوم کے افراد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے، سینے سے لگائے پھرتے ہیں. یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف، چھوڑنے کے تصوّر تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا ان کی کائنات لٹی جارہی ہے. غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین و نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ انسان کی اپنی کوششیں انہیں چاک نہیں کرسکتیں. اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون چاک کرے؟ اس لئے کہ اس ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے. مبدار فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس مقام سے آتے رہیں جو وراثت د ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر ہے (یعنی وحی کے ذریعہ). لیکن سوال یہ ہے کہ ان پیغامات خداوندی سے ہدایت حاصل کرنے کا طریق کیا ہے؟ اور وہ روش کون سی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہوا جاسکتا. اس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے. ذہن و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے. ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کرکے جس ڈگر پر چلے آرہے ہیں اسی پر نہ

عقلِ انسانی

چلتا جائے. اگر انسان نے فکر و نظر سے کام نہ لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی گم ہوجائے گی. روشنی سے تو وہی مستنیر ہوسکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے آنکھیں بند کرکے دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے. فرمایا.

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ

لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی ان کے غلط اعمال کی وجہ سے ان کا بالآخر ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے) یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے. آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے. کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے (وہ عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کر کے) چارپایوں کی مانند ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے ایسے ہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے.

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش متشکل ہوتی چلی آرہی ہے. یعنی قانونِ خداوندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان (ان قوانین کی روشنی میں) اپنی عقل و فکر سے کام لے اور اس طرح زندگی کی صحیح راہوں پر چلتا جائے. اس کے برعکس وراثتی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر کرے بلکہ ضد سے اسی روش پر جما رہے جس پر اس کے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں. اور جسے وہ وراثتی اور گردوپیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے. اس کا نتیجہ جہنم ہے. جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا اس دن سے علم و بصیرت اور تقلید و جمود کی یہ کشمکش جاری ہے. قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کر کے اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں. چنانچہ مندرجہ صدر آیات میں مذکور ہے کہ

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۷/۱۷۶)

سو اے پیغمبر! ان تاریخی سرگزشتوں کو لوگوں سے بیان کرو تاکہ وہ ان پر غور و فکر کریں.

تاریخی یادداشتیں

قرآنِ کریم کے بیان کردہ امم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجیے. آپ دیکھیں گے کہ بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان حقیقت کے راستے سے ہٹ جاتے تھے. اس کے بعد حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے آسمانی انقلاب ان تک آتا. لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے

کہ وہ پیغام ان کے آبا و اجداد کی روش کے خلاف ہوتا، حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی۔ لیکن وہ لوگ غور و فکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آرہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قومِ حضرت نوحؑ کو لیجئے۔ ان تک پیغام خداوندی آیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۲۳/۲۴)

ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

تقلیدِ آباء یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

قومِ نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کو لیجئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ خدائے قہار کی عبودیت اختیار کرو تو انہوں نے کہا:

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ

(۷/۷۰)

کیا تم صرف اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔

وہی سازِ کہن، کہ جس روش پر اسلاف چلے آرہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے؟ یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں، کوئی بُرہان نہیں۔ بس دلیل ہے تو فقط یہ کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ان کے آبا و اجداد چلتے آرہے ہیں۔

قومِ ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مردِ صالح سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا۔ لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہہ دی جو ان کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی تو انہوں نے مُنہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ کیسا افسوس کا مقام ہے! اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ

نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ

(۱۱/۶۲)

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار کریں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔

ایسا ہی جواب حضرت شعیبؑ کو اپنی قوم کی طرف سے ملا۔ جب انہوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رُو سے آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے تھے تو قوم نے جواب دیا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ

(۱۱/۸۷)

قوم نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آ کر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے آئے ہیں۔ یا یہ کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

غور فرمائیے! اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک رہی ہے؟ یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی تنہا راہ راست پر ہے؟ اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انہیں معصوم و منزہ عن الخطا سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے۔

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کیا جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر گئے۔ چونکہ ان باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انہوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے ماتحت ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۷۸)

انہوں نے کہا کہ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے، اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں حکومت تم دونوں بھائیوں کے لئے ہو جائے۔ ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں۔

ملّتِ حنیفہ کے موسسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر ان کے آباو اجداد چلتے آرہے تھے تو انہیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ○ (۲۱/۵۳)

انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔ وہ ان ہی کی پرستش کیا کرتے تھے۔

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغامِ خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباو اجداد کے طور طریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور جن کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ ان کے اسلاف کبھی غلطی نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی۔ چنانچہ سورۂ ابراہیمؑ میں تمام اقوامِ سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاء کرامؑ سے یہی کہا کہ

تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۴/۱۰)

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبادت ہمارے آباو اجداد کرتے چلے آئے ہیں ان سے ہمیں روک دو۔

قرآن اور اسلاف پرستی

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نورِ آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس قندیلوں کی شکل میں آتا رہا، قرآن کی شکل میں مہر عالمتاب بن کر چمکا تو شپرہ چشم لوگوں نے حسبِ معمول یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم آنکھیں نہیں کھولیں گے، اس لئے کہ ہم نے اپنے آباو اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ (۴۳/۲۲)

بلکہ انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چلے جا رہے ہیں۔

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد جب معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر وراثتی اثرات کے ماتحت چلے جا رہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے، اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آبا و اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے، کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ انوکھی نہیں، بلکہ مسخ شدہ ذہنیتوں کا تقاضا ہی ہوتا ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند رکھنے والے خفاشوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے مُنہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○ (۴۳/۲۳)

اور اسی طرح (اے رسول!) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خود تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو، کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہن ہی پر چلے جاؤ گے؟ یعنی اگر تم اس دعوتِ جدیدہ اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کرو تو ہم بتائیں کہ یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے، لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سیدھی اور محکم نہیں تو اس کا کیا جواب؟

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (۴۳/۲۴)

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آبا و اجداد چلتے تھے

کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے؟) انہوں نے کہا کہ (ہمارے پاس دلیل و حجت تو ہے نہیں لیکن) بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دے کر تم بھیجے گئے ہو۔

یہی جواب سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کر دینے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ

(۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو پھر بھی تم عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے)۔

○

انسانی ضد اور جہالت، بے دانشی اور بے راہ روی، وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے' جو انسان کے' آنکھ کھولنے کے دن سے لے کر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہدِ مبارک تک مسلسل چلی آ رہی تھی۔ لیکن کیا اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ ختم کیسے ہو سکتا تھا؟ ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے۔ سو جب تک ابنِ آدم دنیا میں موجود ہے ابلیسانہ حربے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی اُمتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ عرصہ تک لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کا اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آ جاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ شروع میں گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی، لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں، غیر شعوری طور پر اپنے آبا و اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت، اس غلط مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک اور رسول آ جاتا۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف و الحاق شروع کر دیا تھا۔

آج بھی وہی حالت ہے

نیز کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادثِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہرحال وہ پیغام اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور تجدیدِ دعوت کرتا۔ نبیؐ اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصل شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہِ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں۔ یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس روش سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہر قدم کا جائزہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جوں ہی کوئی قدم غلط طریق پر اُٹھنے لگے اسے فوراً قرآن کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روشنی پر گامزن رہا لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہ سہی دوسرا سہی، غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملتِ واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک فرقہ صحیح روش پر نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ میں راہِ راست پر ہوں اور دوسرے فریق غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی اُمتوں میں سے کسی اُمت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں، ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا، تو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا؟ وہی جواب جو ملتا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا۔ لیکن اس کو وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ "ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تمہیں ایک راہِ راست پر چلنے والے رہ گئے" آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن جو روشنی رسولوں کی وساطت سے ملا کرتی تھی وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآنِ کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لا کر قوم کو بتاتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کون سی ہے، اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اسے قبول

کرنے پر تیار نہیں. وہ کہتا ہے کہ بھائی میں تو کچھ نہیں کہتا. کہنے والی خدا کی یہ کتاب ہے. ان کی طرف سے اس کا کیا جواب ملتا ہے ؟ اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت ! کہ لو بھائی یہ آ گیا کہیں سے بڑا معتبر ! بھلا ہمارے اسلاف قرآن نہیں جانتے تھے ؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی ! اس میں بحث وجدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں. یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روش ! تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں. اس کا بھی وہی جواب ملتا ہے کہ ہمیں پرکھ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں. ہمارے اسلاف نے سب کچھ دیکھ پرکھ لیا تھا. اس میں شبہ نہیں کہ اگر انسان سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کر سکتے تھے تو اس سے ان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے. بالخصوص جب کہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت وارادت مندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں. لیکن تنقید کی حد سے بالا صرف وحیِ الٰہی ہوتی ہے. غلطی کا امکان ہر انسان سے ہوتا ہے. اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آ سکتا. ہم اپنے ہمعصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں. ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں. یہی ہمعصر آیندہ نسلوں کے اسلاف بن جاتے ہیں. اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا یا انہیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنا کس دلیل کے ماتحت ہو سکتا ہے ؟ محض یہ اتفاق کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پا چکا ہے، اسے منزہ عن الخطا نہیں بنا سکتا ! اس کی تحقیقات کو قرآنی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہو جاتی. ہر شخص کا فہم، ادراک، تحقیق، اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے. اس لئے اگر زمانہ مابعد کا انسان اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو اس سے اس پیش رو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا. وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا. اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخورِ تحسین ہے. لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحیِ منزّل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے. نیز یہ تنقید و تحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہو گی. بلکہ قرآنِ کریم کے مطابق ہو گی. اگر زیرِ تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہوا تو ہو المراد. اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہو سکتا ہے ؟ اور اگر وہ قرآنِ کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کر لینے میں کون سی خفت ہو جائے گی ؟ قرآنِ کریم تو وہ نصابِ حیات ہے جس کے اتباع کا حکم خود ذاتِ رسالتمآبؐ کو بھی تھا.

قرآن میں آ با روش

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)

اے رسولؐ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے دی گئی ہے تم اس کی پیروی کرو۔

اس لئے قرآنِ کریم کے اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا ذاتی خیال بھی ترک کردینا پڑے تو اس میں ذرا سا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں رکھنا چاہیئے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آرار کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔ اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوجائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان ہے درہم برہم ہوجائے۔ دینِ خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے' اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی اور یہی حق ہے جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اندھی تقلید کی بنا پر نہیں۔ کورانہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت نہ صرف صاحبِ قرآن (صلعم) ہی کا خاصہ و امتیاز تھا بلکہ حضورؐ کے متبعین کی بھی یہی روشِ زندگی بتائی گئی ہے ارشاد ہے:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ (۱۲/۱۰۸)

(اے رسولؐ!) تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میرا اتباع کیا ہے وہ بھی (اسی حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔

فرمائیے کہ جو نظریات و معتقدات' وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت' اسلاف کی بے جا عقیدت مندی کے تابع اختیار کئے جائیں' ان کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟

○

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہ

مسلمان کی روش

تنذیر اُمِ سابقہ کے متعلق یا زیادہ سے زیادہ نبیِ اکرمؐ کے زمانے کے منکرین کے متعلق تھی، ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں. حالانکہ قرآنِ کریم میں اقوامِ گزشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں. لیکن ہم ہیں کہ قدم بہ قدم امِ سابقہ کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں. اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے. ذرا غور فرمائیے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، تو آپ اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کرسکتے اس لئے کہ وہ کون سا مسلک و مشرب ہے جو اسلاف سے منتقل ہو کر آیندہ نسلوں کو نہیں ملا. لہٰذا حق و صواب کی یہ راہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوشِ قدم کی سند ہو. بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتابِ زندہ اس کی تائید کرے. جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز خواہ وہ ہمارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہو، کچھ حقیقت نہیں رکھتی. اس وقت حق و صداقت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ خدائی سند کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے، خواہ اس سے ہمارے اپنے خیالات کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدت مندی پر حرف آئے. قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۂ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے.

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَآءَنَآ ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَٰنُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو دیکھا ہے خواہ (اس روش کے مطابق) انہیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو.

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوشِ قدم پر بلا سوچے چلے جانے ہی میں نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں. اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے.

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ
بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ (۳۱/۲۲)

اور جس نے اپنے آپ کو بہ خلوصِ قلب خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔

یعنی دینِ محکم نہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات ہی کا اتباع کرنے لگ جائیں اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بغیر دیکھنے پرکھنے کے اس پر گامزن ہوتے چلے جائیں۔ دینِ قیّم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات، سب کو قرآنِ کریم کے ترازو میں رکھ دیں۔ جو کچھ اس پر پورا اترے وہ قابلِ تسلیم۔ جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو وہ بلا تامّل ردّ کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔

اس مسلکِ صحیحہ کے اتباع کی ضرورت یوں تو عام حالات میں بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ ہمارے سامنے ایک نئی زندگی اور زندگی کی نئی تعبیر آئی ہے۔ جب ہم نے اپنی زندگیوں کے لئے نئے قالب اختیار کرنے ہیں۔ جب اپنے لئے ایک نیا نظامِ حیات مرتّب کرنا ہے۔ اس مسلک کی ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آئینِ نو کی تدوین[1] میں جو مشکل سب سے زیادہ عناں گیر ہو رہی ہے وہ یہی احساس ہے کہ بہت سے عقائد اور احکام جو اسلاف سے متوارث چلے آرہے ہیں ایسے ہیں جو ہماری نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن چونکہ انہیں مذہب کی مقدّس سند مل چکی ہے اس لئے انہیں چھوڑتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی ہے نتیجہ اس کا یہ کہ نہ ان تصوّرات کو قائم ہی رکھا جا سکتا ہے نہ چھوڑا ہی جا سکتا ہے۔ قائم رکھنے میں زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ چھوڑنے میں اسلاف کے مسلک کی خلاف ورزی کا احساس دامنگیر ہو جاتا ہے۔

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را

لیکن یہ مشکل ہماری اپنی پیدا کردہ ہے حقیقی نہیں۔ اس کا علاج واضح ہے۔ یعنی ہم خدا کی کتاب کو

---

[1] اس مقالہ کا یہ حصّہ تشکیلِ پاکستان کے بعد کا اضافہ ہے۔

اپنا نصب العین قرار دیں. اور اس کے سوا جو کچھ ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اسے اس میزان پر تول لیں. جو اس پر پورا اُترے وہ قابلِ قبول. جو پورا نہ اُترے، وہ جھٹک کر پھینک دینے کے قابل. خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کی جا رہی ہو.

نُسخہ اور اُس کا اِستعمال

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

حکیم صاحب کا کمرہ مریضوں سے بھر رہا تھا۔ حکیم صاحب باری باری ایک مریض کی نبض دیکھتے۔ شاگرد کو نسخہ لکھوا دیتے۔ مریض آگے بڑھ جاتا اور شاگرد سے نسخہ بھی لے لیتا اور ترکیبِ استعمال بھی سمجھ لیتا۔ ایک مریض جب نسخہ لے کر جانے لگا تو حکیم صاحب نے خاص طور پر پوچھا کہ ترکیبِ استعمال سمجھ لی ہے۔ اس نے کہا جی ہاں! گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر۔ چھان کر سوتے وقت پی لینا ہے۔

حکیم صاحب کا مطب

ایک ہی مرتبہ۔ حکیم صاحب نے سر ہلایا اور کہا کہ ہاں! احتیاط سے پینا۔ اور کل صبح آکر اطلاع دینا۔ مرض کو معمولی نہ سمجھنا۔

دوسری صبح مریض پھر آیا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ ہاں کہو کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا "نہیں حضور! کچھ فرق نہیں، بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔" حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس لی۔ اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا "اچھا لاؤ۔ نسخہ دکھاؤ۔"

"نسخہ"؟ مریض نے کہا "حضور! نسخہ تو میں نے جوش دے کر پی لیا۔ نسخہ کہاں سے نکالوں؟" حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "کیا کہا! نسخہ پی لیا۔" "جی حضور! نسخہ جوش دے کر چھان کر پی لیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھلنی میں رہ گئے تھے انہیں میں نے پھینک دیا تھا۔" حکیم صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ جوشِ غضب میں بولے "ارے بدبخت۔ ایسا احمق! نسخہ کو جوش دے کر پی گیا۔" مریض حیران تھا کہ اس سے کیا خطا ہو گئی۔ اس نے تو بالکل ویسا ہی کیا تھا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ حکیم صاحب

نے پھر چلاّ کر کہا" ارے بیوقوف! کبھی نسخہ کو جوش دے کر بھی پیا کرتے ہیں ؟" مریض ابھی تک ششدر تھا. اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معمّہ ہے ؟ حکیم صاحب نے اپنی ڈانٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا" پاگل! نسخہ میں جو دوائیاں لکھی تھیں انہیں دوائی خانہ سے لینا تھا اور وہ دوائیاں جوش دے کر پینی تھیں نہ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو جوش دینا تھا جس پر دوائیاں لکھی تھیں." مریض کو اب معلوم ہوا کہ اس کے مرض میں افاقہ کیوں نہیں ہوا ؟

مریضوں کے ہجوم میں ہر شخص اس مریض کی حماقت پر ہنستا ہوا واپس آگیا. شام تک شہر کے گلی محلے میں نسخہ کے اس انوکھے استعمال کا چرچا ہونے لگا. جو سنتا' قہقہہ لگاتا. لیکن نہ سمجھتا کہ یہ ہنسنا اس مریض پر نہیں' خود اپنے آپ پر ہنسنا ہے. اسے آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے حکیمِ مطلق نے نسخہ

آپ کی اپنی حالت

دیا تھا جس کی حذاقت پر اس کا ایمان ہے. وہ نسخہ انسانیت کے تمام کہنہ اور پیچیدہ امراض کی مکمل تشخیص کے بعد مرتب ہوا تھا. لیکن اس نے اس نسخہ کے ساتھ بعینہٖ وہی کچھ کیا جو اس مریض نے کیا تھا. جس کی حماقت پر یہ یوں ہنستا تھا. اس نے اس نسخہ عظیمہ کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا. کبھی تعویذ بنا کر گلے میں لٹکایا کبھی زعفران اور مشک و عنبر سے لکھ کر دھو دھو کر پینا شروع کر دیا. کبھی دوائیوں کے نام کی گنتی شروع کر دی. نتیجہ یہ کہ مرض روز بروز بڑھتا گیا' اور مشکل اندر مشکل یہ کہ جب کبھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نسخہ کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا تو جھلاّ کر اس کے پیچھے پڑ گئے. پھر طرّہ یہ کہ نسخہ کے اس انوکھے استعمال میں کچھ عوام ہی مبتلا نہیں' بلکہ ایسی ایسی جلیل القدر ہستیاں بھی جنہیں خود طبیب ہونے کا دعوےٰ ہے. کہیۓ! جس قوم کی یہ حالت ہو جائے' اس کی شفایابی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے ؟ افسوس کہ مسلمان نے یہ سمجھا ہی نہیں

قرآن کی عظمت

کہ وہ نسخہ کیمیا جو کائنات کے حکیم و خبیر نے عطا کیا تھا اس کی عظمت کیا ہے. وہ عدیم المثال اور عدیم المرتبت نسخہ جس کے متعلق اس حکیمِ مطلق کا ارشاد ہے کہ :-

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ۙ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ ۙ
اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۙ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗۤ
اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ (۵۶/۷۸-۷۵)

اے راہ گم کردہ انسانو! میں تمہیں اس لامحدود وسعتوں والے آسمان کے) ستاروں کے بلند مقامات کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں۔ اگر تمہیں علم ہوتا تو سمجھ لیتے کہ یہ شہادت کتنی عظیم الشان شہادت ہے کہ یہ قرآن بڑی ہی قابلِ قدر و عزت کتاب ہے (جس کے حقائق فطرت کے) چھپے ہوئے صحیفے میں (لپٹے پڑے ہیں) لیکن اس کے حقائق کو سمجھنے کے لئے قلب و نظر کی پاکیزگی ضروری ہے۔ یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو تمام کائنات کی پرورش کرنے والا ہے۔

غور فرمایئے! رصدگاہِ آسمانی کی بے پناہ بلندیوں کو گواہ ٹھہرا کر بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کس قدر عظمت و توقیر، عزت و تکریم والی کتاب ہے۔ یہ نسخۂ عظیمہ کیسا نایاب اور بے مثال اور اپنے اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے کیسا بلند اور یقینی ہے۔ لیکن اس کا اثر اور نتیجہ تو انہی کے لئے ہوگا جو اسے صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ جو اسے "جوش دے کر پی جائیں گے" انہیں فائدہ تو ایک طرف الٹا نقصان ہوگا۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ (۱۷/۸۲)

ہم نے جو کچھ قرآن میں نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے (یکسر) شفا اور رحمت ہے۔ لیکن جو اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے ان کے لئے نقصان میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

قرآن کا صحیح استعمال

قرآن کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے۔ لیکن اگر نسخے کے انوکھے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوؤں سے باندھ لیا جائے۔ گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے۔ اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کر دی جائے۔ اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس انوکھے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے گی تو نتیجہ سوائے نقصان کے اور کیا ہوگا؟

قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے۔ اور اس کے زندہ و پائندہ، درخشندہ و تابندہ

ظلم کے معنی ہیں وضع الشئ فی غیر موضعہ المختص بہ (المفردات) کسی شے کا غیر محل استعمال۔

نتائج اسی وقت مرتب ہو سکتے ہیں جب اس کی حامل قوم کا عمل اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو، نہ یہ کہ اس کے حروف والفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے۔ قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ خود قرآن ہی کا فیصلہ ہے۔

اس سے پیشتر طلوعِ اسلام کے صفحات پر قرآنِ کریم کے اسی بے محل استعمال کے چند نمونے پیش کئے جا چکے ہیں جو ہمارے علومِ دینیہ کے مرکز دیو بند شریف سے شائع ہونے والے رسالہ "خالد"ے نقل کئے گئے تھے۔ آج اسی قبیل سے کچھ اور پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک بزرگ ہستی کے تجویز فرمودہ ہیں۔ جو ہندوستان کے اربابِ شریعت و طریقت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ علومِ شریعت میں بھی مرجع انام تھی اور رموزِ طریقت میں بھی بے شمار انسانوں کے نزدیک منبع فیوض۔ قرآنِ کریم کے مفسر و مترجم، بے شمار کتبِ دینیہ کے مصنف اور ایک بہت بڑے آستانہ کے مسند نشین۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے ارشادات کو دیکھئے اور پھر غور فرمایئے کہ جب خود ایک حکیم الامت نسخہ کو جوش دے کر پینا شروع کر دے اور اسی کی تلقین کرے، تو مریضوں کا خدا حافظ!

اعمالِ قرآنی

لیجئے اب وظائف ملاحظہ فرمایئے۔ قارئین کی سہولت کے لئے ہر ایک وظیفہ کے بعد ہم نے آیت متعلقہ کا ترجمہ (جس کا مفہوم سمجھ میں آجائے) قوسین میں لکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۲/۷۱)

خاصیت:۔ یہ آیت پڑھ کر خربوزہ یا کوئی چیز تراشے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیریں و لذیذ ہو گی۔

(آیت کا مطلب:۔ سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ایک گائے (بیل) ذبح کریں۔ انہوں نے اس سیدھے سادے حکم کی تعمیل میں بیسیوں حجتیں کیں، اور بصد مشکل اس پر آمادہ ہوئے۔ فَذَبَحُوْهَا۔ پس انہوں نے ذبح کیا۔ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ۔ اور ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کریں۔ یہ تھا قرآن کا مفہوم اور یہ ہے اس آیہ مقدسہ کا استعمال جسے حکیم الامت نے تحریر فرمایا ہے۔ غالباً لفظ ذبح سے مطلب خربوزہ تراشنا لیا گیا ہے۔

لہ یہ مضامین ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئے تھے۔

(۲) اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ۝ (۳/۸۲)

خاصیت:۔ اگر سواری کا کوئی جانور گھوڑا اونٹ سواری کے وقت شوخی اور شرارت کرے اور چڑھنے نہ دے تو اس آیت کو تین مرتبہ پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دے۔ انشاء اللہ تعالیٰ سیدھا ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ کیا یہ لوگ اللہ کے قانون کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ (انہیں دیکھنا چاہیئے کہ) آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً وکرہاً اسی کے (قانون کے) سامنے جھکا ہوا ہے اور سب کی گردشیں انہی محور کے گرد ہیں۔ یعنی جب کائنات کی ہر شے اللہ کے قانونِ مشیت کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو کیا انسان جو خود کائنات ہی کا ایک جزو ہے اپنے لئے قرآن کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے)۔

(۳) اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ
بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۱۱/۵۶)

خاصیت اگر کوئی لونڈی یا غلام سرکش ہو تو بال پیشانی کے پکڑ کر تین مرتبہ اس کو پڑھے اور اس پر دم کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تابعدار اور مسخر ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ میں اس اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (اور جس کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر ہے کہ) کوئی جاندار ایسا نہیں جسے وہ پیشانی سے پکڑ کر اس سے مواخذہ نہ کرے یقیناً میرا رب ایک متوازن ہدوش راستہ پر ہے۔ یعنی اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

(۴) كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ (۱۸/۱۸)

خاصیت:۔ اگر راستہ میں شیر یا کتا حملہ کرے اور شور مچا دے تو فوراً اس آیت کریمہ کو پڑھ لے چپ ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ سورۂ کہف میں ہے کہ اصحابِ کہف کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہے۔ آیت اور اس کی خاصیت کا باہمی ربط ظاہر ہے)۔

(۵) اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝ وَ اِذَا الْاَرْضُ

مُدَّتْ ۝ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۝ (۴-۱/۸۴)

خاصیت :۔ ان آیتوں کو لکھ کر ولادت کی آسانی کے لئے بائیں ران میں باندھ دے انشاء اللہ تعالیٰ بہت آسانی سے ولادت ہوگی۔ مگر بعد ولادت تعویذ فوراً کھول دینا چاہیئے۔ اور اسی عورت کے سر کے بال کی دھونی مقامِ خاص پر دینا مفیدِ ولایت ہے۔

(آیات کا مطلب :۔ یہ سورۃ انشقاق کی آیات ہیں جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ ترجمہ یہ ہے "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سُن لے گا اور وہ اس لائق ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر بڑھادی جائے گی۔ اور زمین اپنے اندر کی چیزوں کو اُگل کر خالی ہوجائے گی" ربط ظاہر ہے)۔

(۶) اگر دردِ زہ سے تکلیف ہو تو عورت موطا امام مالکؒ (مجموعہ احادیث) پر ہاتھ رکھے فوراً ولادت ہو جائے گی۔

(۷) فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۲/۱۳۷)

خاصیت :۔ جس سے حاکم ناراض وخفا ہو وہ اس آیت کو پڑھا کرے یا لکھ کر بازو پر باندھ لیوے۔ انشاء اللہ تعالیٰ حاکم مہربان ہوجائے گا۔

(آیت کا مطلب :۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلی دی ہے کہ ان سرکش مخالفین کی فتنہ انگیزیوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ان سب کے خلاف تیرے لئے کفایت کرے گا۔ وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

(۸) جو شخص ساتوں حٰم کو پڑھا کرے اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہوجائیں گے۔

(۹) هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ (۵۹/۲۲)

خاصیت :۔ اسمِ اعظم اس میں مخفی ہے۔ جو کوئی صبح کے وقت سات مرتبہ پڑھے تو شام تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور اگر اس دن میں مرے تو شہید کا درجہ پائے گا۔ اور اگر شام کو پڑھے تو صبح تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں۔ اور جو اس شب میں مرے تو درجہ شہادت کا پاوے۔

ترجمہ :۔ (اللہ کی ذات وہ ہے جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ وہ غیب وشہادت کا جاننے والا اور رحمٰن ورحیم ہے)۔

(۱۰) القیوم۔

خاصیت:۔ اس کے پڑھنے سے کثرت سے نیند آتی ہے۔

(القیوم یعنی ایسا قائم کہ جسے اپنے قیام وبقا کے لئے کسی آسرے کی ضرورت نہ ہو۔ غالباً "نیند" کی طرف خیال اس لئے گیا کہ القیّوم کے بعد ہے کہ نہ اسے نیند چھو سکتی ہے نہ غنودگی۔ حالانکہ القیوم کی تاثیر سے تو سونے والوں کو بھی بیدار ہو جانا چاہیئے!)

(۱۱) المغنی۔

خاصیت:۔ اگر مشغولیٔ جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔

(المغنی۔ سب سے بے نیاز اور سب کا حاجت روا)۔

(۱۲) الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْم۔

خاصیت:۔ اگر طالب مطلوب کا نام مع نام والدہ کے لکھے، اس کی محبت میں سرگرداں ہو۔ بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

(۱۳) انا للہ و انا الیہ راجعون ؁

خاصیت:۔ اگر یہ آیت پڑھ کر گم ہوئی چیز کی تلاش کی جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور مل جائے۔ ورنہ غیب سے کوئی چیز اس سے عمدہ ملے گی۔

(مطلب آیت:۔ قرآنِ کریم میں مصائب و مشکلات میں استقامت کی تلقین کے بعد فرمایا کہ جماعتِ مومنین کا مطمعِ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری تمام جدّوجہد مشیت کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور ہماری سعی و عمل کی تمام گردشیں اسی کے قانون کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔

(۱۴) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ (۲۲/۱)

خاصیت:۔ حفظِ حمل کے لئے مفید ہے۔

(۵) اگر پوری سورۂ نوح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا۔

○

ایک اور وظیفہ اتنے ہی ارشادات کافی ہیں۔ زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ورنہ کتاب میں تو بڑے بڑے دلچسپ خواص لکھے ہیں۔ ان وظائف وغیرہ کا نام رکھا جاتا ہے "قرآن

کے اعمال"۔ حالانکہ قرآن کا عمل تو صرف وہی عمل کہلا سکتا ہے جو قرآن کے احکام کے اتباع میں سرزد ہو۔ مؤلف کتاب نے ایک اور دلچسپ وظیفہ بھی لکھا ہے۔

> احقر کو مرشدی... نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجت مند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کیا کرو۔ چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس کی حاجت کے مناسب کوئی آیتِ قرآنی یا کوئی اسمِ الٰہی سوچ کر لکھ دیتا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس میں برکت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بی بی کی مانگ باوجود کوششِ بار بار کے سیدھی نہ نکلتی تھی۔ احقر نے کہا اھدنا الصراط المستقیم پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا کہ مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ اور کوئی طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امیدِ نفع اور برکت ہے۔

غور فرمائیے! ان "اعمالِ قرآنی" نے خود قرآنِ کریم اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس زندگی میں فراخیٔ رزق، نیک اولاد، دشمن پر غلبہ، عزت کی زندگی، شیطان سے دوری، غیبی خزانوں کا علم، چوری سے حفاظت، ادائیگیٔ قرض، جملہ جسمانی امراض سے شفا اور آخرت میں جنت، شہادت کا مرتبہ، رسول اللہ کی شفاعت، دوزخ سے نجات، غرضیکہ اس دنیا میں اور آیندہ زندگی میں جس چیز کی بھی تمنا کی جاسکتی ہے اس کے متعلق چند اوراد اور وظائف کے پڑھنے سے، یا اگر پڑھ نہ سکتا ہو تو لکھ کر چاٹ لینے سے یا بازو پر باندھ لینے سے غیر مشروط طور پر گارنٹی دی گئی ہے۔ اور کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں جس کے لئے قرآنِ کریم کو ضابطۂ حیات بنایا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے اعمالِ قرآنی جو محمد رسول اللہ والذین معہ کا ضابطۂ زندگی بنے تھے کچھ پیچیدہ اور لمبے راستے ہیں اس لئے ان کی جگہ اس زندگی میں کامیابی اور آخرت میں سرفرازی کے لئے (SHORT CUT) قرآن کی آیات کے ان "باطنی معانی" میں مضمر ہے جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صبر آزما مرحلے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور یوں مفت میں بیٹھے بٹھائے جنت مل جاتی ہے۔

بہشتے بہر اربابِ ہمم است   بہشتے بہر پاکانِ حرم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش   بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

اثر کس طرح ہوتا ہے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان اوراد و وظائف کو خود کرکے دیکھ لیجئے۔ ان میں واقعی اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ ورد قرآن کی آیت کا کیا گیا ہے۔ جو لوگ قرآنِ کریم سے واقف بھی نہیں اور کھلا ہوا شرک کرتے ہیں وہ بھی ایسے ایسے اعمال کرتے اور بتاتے

ہیں جو تاثیر کے اعتبار سے ان اوراد و وظائفِ قرآنی سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں. کیونکہ تاثیر زیادہ تر عمل کرنے والے کی فنی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اس (PHENOMENON) کا تعلق علم النفس (PSYCHOLOGY) سے ہے. ایک خاص طریقہ سے جن الفاظ کو بھی بطور وظیفہ پڑھیے یا لکھیے اس قسم کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں -- تفصیل اس اجمال کی طویل ہے جسے ہم انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے. اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کس طرح نسخہ کا یہ انوکھا استعمال طبیبِ مطلق کے بتائے ہوئے علاج سے باز رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وارثینِ کتاب کی وہ جماعت جسے دنیا کی امامت کے لئے پیدا کیا گیا تھا آج دنیا میں سب سے پیچھے ہے. ان کی وہ عملی قوتیں جو انھیں دنیا کے سخت سے سخت مقابلہ میں سینہ سپر کر دیا کرتی تھیں مفقود ہو چکی ہیں قرآنِ کریم کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے. لیکن اس کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے. جھاڑ، پھونک اور گنڈہ تعویذ سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں. یہ سب عجمی اثرات کا نتیجہ ہے.

خدا اور قیصر

(۱۹۵۵ء)

رمضان المبارک کی انتیسویں تاریخ ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ افطار کے بعد ہر شخص کی آنکھیں ایک خاص سمت کو اُٹھ رہی ہیں کہ دیکھیں وہاں سے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ کل عید ہو گی یا ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ تذبذب کی وجہ سے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں۔ دوکاندار، دوکانوں پر سودے نہیں لگاتے کہ نہ معلوم کل کے متعلق کیا فیصلہ ہو، خریدار چیزیں نہیں خریدتے کہ پہلے کچھ فیصلہ ہو جائے تو پھر خریداری شروع کی جائے۔ غرضیکہ

مملکت کا گورنر جنرل بھی انتظار میں ہے۔

وزیر اعظم بھی انتظار میں ہے۔

کابینہ کے وزرار بھی انتظار میں ہیں۔

عدالتوں کے جج انتظار میں ہیں۔

فیڈرل کورٹ کا چیف جسٹس بھی انتظار میں ہے۔

پولیس کا انسپکٹر جنرل انتظار میں ہے۔

فوج کا کمانڈر انچیف بھی انتظار میں ہے۔

یہ سب انتظار میں ہیں کسی کے فیصلے کے! یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب کس کے فیصلہ کے انتظار میں ہیں؟ وہ کون سا مرکز ہے جس کی طرف مملکت کے کروڑوں انسانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں؟ وہ

کون سی اتھارٹی ہے جس کے پیشِ نظر یہ تمام اربابِ اقتدار و اختیار دم بخود بیٹھے وقفِ انتظار ہیں اور کوئی جرأتِ لب کشائی نہیں کرتا؟

یہ کروڑوں نگاہوں کا مرکز، یہ اتھارٹی اور اقتدار کا سب سے بڑا سرچشمہ، کراچی کی ایک مسجد ہے جس میں دو تین مولوی صاحبان بڑے عزّ و تمکنت سے بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ کل کے لئے عید کا فیصلہ کر دیا جائے یا ایک روزہ اور رکھا دیا جائے۔ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ کل عید ہے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ کل کا روزہ رکھ لے اور اگر ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ کل کا روزہ رکھنا ہوگا تو کسی کو اس کی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ عید کر لے۔ ان کے اس فیصلے کے خلاف نہ گورنر جنرل دم مار سکے گا نہ کمانڈر انچیف۔ نہ کوئی جج اس کے خلاف جا سکے گا، نہ چیف جسٹس۔ سب کو اس فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ نہ ان میں سے کوئی اس فیصلہ سے پہلے اس معاملہ میں دخل دے سکتا ہے۔ نہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد اس کے خلاف کہیں اپیل ہو سکتی ہے۔ پوری کی پوری قوم پر ان کی حکومت ہے۔ حالانکہ قوم ان فیصلہ کرنے والوں کو خوب جانتی پہچانتی ہے۔ حتّٰی کہ جس وقت لوگ ان کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے اس وقت بھی ان کے متعلق آپس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے، لیکن اس کے باوجود فیصلہ انہی کا ماننا تھا، نہ کہ کسی اور کا۔ غور کیجئے کہ ان حضرات کی حکومت کتنے بڑے اختیار و اقتدار کی حکومت ہے۔

فیصلہ دینے کے بعد ان میں سے ایک صاحب اپنی گاڑی پر روانہ ہوئے۔ چوراہے پر پہنچے تھے کہ ٹریفک کے سپاہی نے سیٹی بجا کر روک لیا اور کہا کہ گاڑی کی بتیاں کیوں نہیں جلائیں؟ انہوں نے کہا ایک بتی تو جل رہی ہے۔ دونوں کی کیا ضرورت ہے؟ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا کہ بتیوں کا حکم چیف کمشنر صاحب کا دیا ہوا ہے۔ اس میں آپ کو مجالِ گفتگو نہیں۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے پرچہ کاٹ کر ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ کل دس بجے تیموری صاحب کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔

کل عید ہوگی یا نہیں ـــــــ اس کا فیصلہ مسجد کے مُلّا کریں گے۔

گاڑی کی بتیاں کس طرح جلائی جائیں گی ـــــــ اس کا فیصلہ چیف کمشنر صاحب کریں گے۔

ایک ہی مملکت میں، ایک ہی شہر میں، دو متوازی حکومتیں!!!

ایک اور منظر سامنے لائیے۔

پولو گراؤنڈ (کراچی) میں عید کی نماز کا اجتماع ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف لا

ہیں. وزیر اعظم صاحب بھی دوزانو بیٹھے ہیں. کابینہ کے وزرار، چیف کمشنر، مجلس آئین ساز کے اراکین سب موجود ہیں. سندھ چیف کورٹ کے جج بھی. اور اتفاق سے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس بھی. سب کسی کے انتظار میں بیٹھے ہیں. وقت گزرتا جا رہا ہے. ہر ایک آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا. بالآخر ایک عبا و قبا میں ملبوس مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں. انہیں آتا دیکھ کر بہت سی آنکھوں میں تحقیر کی ہنسی پھیر جاتی ہے. بہت سے خندۂ زیرِ لبی سے ان کا استقبال کرتے ہیں. وہ آ کر مصلّے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب لوگ صف بستہ ان کے پیچھے خاموشی سے ایستادہ ہو جاتے ہیں. وہ جھکتے ہیں تو سب جھکتے ہیں. وہ اٹھتے ہیں تو سب اُٹھتے ہیں. اس کے بعد وہ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں. یہ سنتے ہیں اور جی ہی جی میں ہنستے ہیں. کیونکہ ان کی باتوں میں سے اکثر ایسی ہیں کہ جن پر ہر صاحبِ عقل و ہوش کو ہنسی آ جائے. لیکن انہیں اعلانیہ ہنسنے کی جرأت نہیں. جب تک امام صاحب کا جی چاہا انہوں نے انہیں باندھ کر بٹھائے رکھا. کسی میں اتنا کہنے کی ہمت نہیں کہ وقت زیادہ ہو رہا ہے. ہمت اور جرأت کیسے ہو. یہاں ان کی حکومت ہے. یہاں انہی کے فیصلے چلیں گے. بہرحال انہوں نے خطبہ ختم کیا. دعا مانگی. محفل برخاست ہوئی. بھیڑ بہت زیادہ تھی. یہ ایک طرف سے تیزی سے نکلنے لگے تو سپاہی نے ڈانٹ دیا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ راستہ حضور گورنر جنرل کے لئے مخصوص ہے. ادھر ہٹ کر چلو. یعنی تمہاری حکومت کا دائرہ اور تھا. اب تم کسی اور کی مملکت میں پہنچ گئے ہو.

ایک ہی میدان میں، پانچ منٹ کے اندر اندر حکومتیں بدل گئیں.

○

اور تیسرا منظر بھی!

جناب وزیر اعظم کے صاحبزادے کی شادی ہے. گورنر جنرل صاحب تشریف فرما ہیں. وزرا سلطنت اعمادِ مملکت، اراکین مجلس آئین ساز. بڑی بڑی عدالتوں کے جج، سب زیب دہِ محفل ہیں. دولہا مجلس میں ہے اور دلہن اندر کمرہ میں. سب کسی کے انتظار میں ہیں. رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں. دیر ہوتی جا رہی ہے. چہ میگوئیاں سب کرتے ہیں. لیکن سب بے بس سے ہیں. کافی انتظار کے بعد مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں. سب تعظیم سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں. وہ (دولہا کے باپ) وزیر اعظم صاحب کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اندر جائیے. وہاں یوں کیجئے اور یوں کیجئے. فلاں فلاں کو ساتھ لے جائیے. گورنر جنرل

صاحب آپ ادھر تشریف لائیے۔ چیف جسٹس صاحب! میں جو کچھ کہوں آپ اس کے گواہ رہیئے۔ وہ سب تعمیلِ ارشاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ الفاظ کہتے ہیں۔ دولہا ان الفاظ کو دہراتا ہے۔ ساری محفل ساکت صامت بیٹھی ہے۔ پھر وہ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جتنا وقت جی چاہے دُعا میں لگا دیتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان سے سبقت کر کے اپنی دُعا پہلے ختم کر لے۔ اس کے بعد وہ وزیر اعظم صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ کا نکاح احکامِ شریعت کے مطابق بہ حُسن وخوبی تکمیل پا گیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نکاح کے متعلق ایک تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی ان مولوی صاحب کی طرف رجوع نہیں کرتا، بلکہ معاملہ اس عدالت تک پہنچتا ہے جسے وزیر اعظم صاحب کی حکومت نے مقرر کر رکھا ہے۔ معاملہ ایسا ہے جس کے لئے پہلے سے واضح قانون موجود نہیں۔ لہٰذا ایک نیا قانون بنانے کے لئے اسے مجلسِ قانون ساز کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اِدھر یہ ہوتا ہے اور اُدھر سے مولوی صاحبان کی طرف سے آواز آتی ہے کہ نکاح وطلاق کے بارے میں قانون بنانے والے تم کون ہونے ہو؟ تمہیں یاد نہیں کہ یہ نکاح خود ہمارا پڑھایا ہوا ہے۔ جب تم سب موجود تھے اور مولوی صاحب کا انتظار کر رہے تھے جب تمہیں نکاح پڑھانے کا حق نہیں تھا تو اب نکاح کے متعلق قانون بنانے کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ یہ ہمارے حدود واختیارات کے معاملات ہیں جن میں تم دخل انداز نہیں ہو سکتے۔

غور کیجئے کہ کیا پاکستان کی آئین سازی کی ہشت سالہ تاریخ، اسی کشمکش ونزاعِ حدود اختیارات ہی کی داستانِ الم انگیز نہیں؟ کیا یہاں آٹھ سال سے یہی کچھ نہیں ہو رہا کہ "قوم کے نمایندے" ایک آئین بناتے ہیں اور "خدا کے نمایندے" یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیتے ہیں کہ تمہیں اس آئین سازی کا حق ہی حاصل نہیں۔ یہ مملکت اسلامی ہے۔ یہاں شریعت کا نظام نافذ ہو گا۔ اور نظامِ شریعت کے مطابق آئین وقوانین سازی کے حقدار ہم ہیں۔ تم نہیں ہو!" قوم کے نمایندے" کہتے ہیں کہ نہیں! ہمیں اس کا حق حاصل ہے۔ یہ کہتے ہیں اور ساتھ ہی عید کے چاند، نماز اور خطبہ اور اپنے بچوں کے نکاح کے لئے فیصلہ" خدا کے نمایندوں" سے طلب کرتے ہیں۔ بات بالکل صاف ہے اگر رویتِ ہلال، خطبۂ عید اور نکاح خوانی میں فیصلہ کا حق مولوی کو حاصل ہے تو یقیناً قانون سازی کا حق بھی اسی کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اگر قانون سازی کا حق اسے حاصل نہیں تو پھر ان اُمور میں فیصلوں کے لئے اس کی طرف کیوں رجوع کیا جاتا ہے؟ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ معاملات

"شریعت" سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان کے لئے اربابِ شریعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ ہے وہ اصلی نکتہ جس کی وضاحت کے لئے ہم نے اس قدر طویل تمہید اٹھائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں امورِ شریعت اور امورِ دنیا دو الگ الگ شعبوں سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ایک دفعہ بیٹھ کر اس کا فیصلہ کر لینا چاہیئے اور دونوں دوائر کی الگ الگ فہرستیں مرتب کر کے خدا کو خدا کی مملکت اور قیصر کو قیصر کی حکومت دے دینی چاہیئے۔

اور اگر یہ دوائر الگ الگ نہیں تو پھر اس شرکِ جلی کو ختم کرنا چاہیئے کہ رویتِ ہلال کا فیصلہ مسجد میں ہو اور عید کی تعطیل کا فیصلہ وزارتِ امورِ داخلہ میں۔ مقامِ اجتماعِ عید کا تعین چیف کمشنر کی طرف ہو اور عید کی نماز مُلّا جیون پڑھائیں۔ وزیرِ اعظم صاحب کے لڑکے کا نکاح مولوی صاحب بندھائیں اور نکاح کے متعلق قوانین کا اجراء وزیرِ اعظم صاحب فرمائیں!

یاد رکھیئے! ایک مملکت میں بیک وقت دو بادشاہ کبھی نہیں سما سکتے۔ جہاں ایسا ہو گا انارکی پھیل جائے گی۔ ماسکو میں قیصر ہی قیصر ہے۔ وہ خدا کو اپنے ہاں آنے نہیں دیتے۔ ویٹیکن (پوپ کی مملکت) میں "خدا ہی خدا" ہے۔ وہ قیصر کو اس مملکت میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ انگلستان میں "خدا" کو گرجا کی چار دیواری میں مقید کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے باہر قیصر کی مملکت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی مملکت میں آ جا نہیں سکتے۔ لیکن ہم ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں "خدا اور قیصر" کی متوازی حکومت جاری کر رکھی ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے (یعنی قرآن کے الفاظ میں) خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد ــــــ کوئی چیز اپنے اصلی اور ٹھیک مقام پر نہیں۔ اور تماشا یہ کہ ہر منبر اور ہر اسٹیج سے یہ آواز بھی برابر بلند ہوتی رہتی ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔ ایسی "خالص منافقت" بھی دنیا میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آئی ہو۔ جب تک یہ دو عملی اور منافقت ختم نہیں کی جائے گی، آپ کا ایک قدم بھی تعمیری منزل کی طرف نہیں اُٹھ سکے گا۔

اسلام کے قرنِ اوّل (عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ) میں اس ثنویت کا تصوّر تک بھی نہیں تھا۔ ایک اسلامی نظام تھا جو "دین اور دنیا" دونوں کو محیط تھا۔ اس میں صوبے کا گورنر، جامع مسجد کا امام بھی ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت آ گئی تو اس نے سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا۔ سیاست کا تعلق مملکت سے قرار پا گیا اور مذہب، علماء کے سپرد ہو گیا۔ اس طرح اسلام میں وہ ثنویت آ گئی جسے مٹانے کے لئے وہ آیا تھا، اور جسے اس نے عملاً مٹا کر دکھا دیا تھا۔ یہی ثنویت مسلمان ممالک میں ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ ہندوستان

میں (تقسیم سے پہلے) انگریز کی حکومت تھی. اس میں تو ہونا ہی یہی تھا کہ سیاست کا تعلق حکمران طبقہ سے ہوتا اور امورِ مذہب، علماء کے سپرد رہتے ___ امورِ مذہب سے مقصود پرسنل لاز (شخصی قوانین) تھے ___ تحریکِ پاکستان کی بنیاد اس تقاضا پر تھی کہ مذہب اور سیاست کی یہ ثنویت خلافِ اسلام ہے، اور چونکہ یہ مِٹ اسی صورت میں سکتی ہے کہ مسلمان، ایک آزاد خطۂ زمین میں اپنی مملکت قائم کریں جس میں دین کا صحیح نظام کارفرما ہو، اور "مذہب اور سیاست" کی یہ ثنویت ختم ہو جائے. پاکستان مل گیا مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی لیکن وہ ثنویت، جسے مٹانے کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا، بدستور چلی جا رہی ہے، بلکہ یہ خلیج پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا ملک میں دو حکومتیں ہیں جو ایک دوسرے سے مسلسل برسرِ پیکار ہیں. اس ثنویت، اور ثنویت کی ایسی شدت کا نتیجہ ہے کہ قوم بھی دو حصّوں میں بٹ گئی ہے اور ان کی باہمی نفرت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے. آپ خود سوچ لیجئے کہ اگر اس ثنویت کو جلد از جلد ختم نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اسے ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے. اور وہ یہ کہ یہاں پھر سے وہ صحیح قرآنی نظامِ مملکت قائم کیا جائے جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے اور جس میں مذہبی پیشوائیت کا الگ وجود نہیں ہوتا.

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ